حقیقت
الہ آباد

افسانہ کہ حقیقت؟

ظفر واسطی
(شاہ آبادی)

قیمت ۱۲ر

اشاعتِ اول ۱۸۰۰

ناشر

سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

باہتمام سید اکبر علی

مطبوعہ

برکاتِ اکبر پریس الہ آباد

۱۹۶۷ء

فہرست
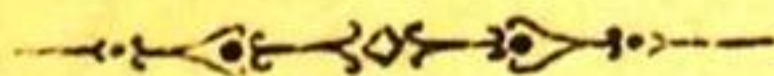
اس کی خدمت میں، جس نے میری درخواست پر، اجنبی ہونے کے
باوصف اپنی عزیز از جان سہیل کی تصویر مجھے بھیج دی تھی ۔

ظفر واسطی

پیش لفظ

ظفر واسطی کا پہلا افسانہ "سزا و جزا" "ادبی دنیا" لاہور کے سنہ ۱۹۲۹ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ ان دنوں ادبی دنیا کی ادارت کے فرائض مولانا (حالی شمس العلما) تاجور نجیب آبادی کے سپرد تھے۔ پھر اسی زمانہ میں ان کا یہ افسانہ اور دو ایک اور افسانے ان مجموعوں میں شامل کئے گئے جو شمس العلما موصوف نے شائع کئے یا کرائے۔

یہ ابتدا ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم

واسطی صاحب کے اکثر افسانوں کے ترجمے انگریزی ہندی اور ہندوستان کی دوسری مشہور زبانوں میں کئے جا چکے ہیں اور اب تو خود انھوں نے انگریزی میں افسانے لکھنے شروع کر دئے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر انگریزی کے بلند پایہ اور معیاری رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اور ان پر بہت اچھے الفاظ میں ریویو کیا جا چکا ہے۔ انگریزی زبان میں ان کے افسانوں کی کامیابی کے پیش نظر یہ اندیشہ بے محل نہیں کہ اگر ان کی کامیابی کا یہ دور دورہ یونہی رہا تو گیسوئے اُردو منت پذیر شانہ رہ جائیگا اور ظفر صاحب کی ذہنی صلاحیتیں جنھیں خدمتِ اُردو کے لئے بروئے کار آنا چاہیے ایک غیرملکی زبان (انگریزی) کی نذر ہو جائیں گی۔

زیر نظر مجموعہ میں ظفر صاحب کے سارے بہترین افسانے تو شامل نہیں لیکن کئی ایسے افسانے ضرور ہیں جن پر اُردو ادب ہمیشہ ناز کریگا۔ اور جیسا کہ پہلے افسانے کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ان کے ہر افسانہ پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ "افسانہ ہے کہ حقیقت؟" ظفر واسطی کے افسانوں میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ پڑھنے والا ان کی حقیقت میں کھو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ایک سچا مگر نہایت دلچسپ واقعہ پڑھ رہا ہے۔ یہ خوبی ان کے انداز تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن بے قدرتاً۔ اسمیں انکی کوشش یا ارادہ کو بالکل دخل نہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس کتاب کے انتساب پر نظر ڈالئے اور بتائیے کہ یہ انتساب "افسانہ ہے کہ حقیقت" جہاں یہ مگر یہ کیسے جذبات سے لبریز ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے وہاں اس پر ایک خوبصورت افسانہ کا بھی دھوکا ہوتا ہے۔

فیروز پور ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء

(ممتاز یوسفی)

افسانہ کہ حقیقت

پہلا خط

تمہارے سارے محبت نامے ملے۔ یہ تمہاری کم نصیبی نہیں بلکہ میری بدقسمتی ہے کہ ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ تم جانتے ہو کاہلی کو میری فطرت میں بڑا دخل ہے، پھر جواب نہ ملنے کا شکوہ کیوں کرتے ہو۔ کیا تم مجھے کاہل نہ کہا کرتے تھے۔ پھر اگر آج میں حقیقتاً کاہل ہو گیا ہوں تو اس کی کیا شکایت۔ اس سے پہلے میرے کاہل ہونے کا تمہیں کبھی یقین نہ آیا تھا۔ گو الفاظ سے دن میں بیسیوں مرتبہ اس بات کا اعادہ کیا کرتے تھے۔ کیا وہ وقت بھول گئے جب میں نے تمہارے اس خطاب کے خلاف "نفرت" اگر "شور" کیا تھا تو تم نے کیسی جلدی ہتھیار ڈال دیئے تھے اور کاہل دوست کو "مستعد" کہنے لگے تھے۔ حیات! وہ زمانہ اب کہاں ہے — میری بہترین خواہش ہے کہ ہم پھر معصوم بچے بن جائیں دنیا کے فکروں سے آزاد — ہر روز صبح کو کتابیں بغل میں لے کر مکتب چلے

جائیں۔ ہنستے بولتے مذاق کرتے، نیا سبق پڑھیں پرانا سنائیں۔ شام کو چھٹی ملے تو اسکول کے میدان میں کھیلیں اور پھر ایک ساتھ واپس چلے آئیں۔ ایک دوسرے سے چھیڑ کرتے، آگے پیچھے دوڑتے چیختے چلاتے گھر آئیں۔ کھانا کھائیں اور لیمپ کے آگے کتابیں لے کر بیٹھ جائیں۔ پھر ناز نخرے کرتے سو جائیں۔ یہ نہیں تو کالج ہی کی زندگی واپس آجائے۔ کتابوں سے برافروختہ ہوں۔ خود کو سارے جہان میں سب سے زیادہ عقلمند سمجھیں۔ اپنی کہیں اور کسی کی نہ سنیں اچھا کھائیں اچھا پہنیں کام کچھ نہ کریں۔ حیات کیا یہ سنہری وقت واپس آسکتا ہے اگر مجھے یقین آجائے کہ میں پھر معصوم دلشاد اور بے فکر ہو سکتا ہوں تو اس کے حصول کے لئے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت اٹھانے کو تیار ہوں۔ آہ وہ وقت بیت گیا ـــ لیکن میرے دل میں اس کی یاد کے گہرے نقش باقی ہیں۔ جو شاید زندگی میں کبھی نہ مٹیں گے، حامد کے نغمے، عبداللہ کی سنجیدگی، شفقت کی خود فراموشی۔ قیوم کے قہقہے اور بشیر اور قاضی کی سرگوشیوں کی یاد مجھے بڑی بے چین کرتی ہے، بیٹھے بیٹھے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور میں بیقرار ہو جاتا ہوں۔

آج کل بہت زیادہ مصروف ہوں۔ شاید تم خیال کرو کہ کوئی ناول لکھ رہا ہوں۔ نہیں دوست تمہارا خیال غلط ہے۔ پچھلے دو ہفتوں سے میں نے کوئی فسانہ تک نہیں لکھا۔ البتہ ناول کا پلاٹ تیار کر رہا ہوں ہیرو کا پارٹ خود ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ہیروئن کا پارٹ ایک تیس سالہ نیم حسین عورت کو دے رکھا ہے اور میں نے کیا دے رکھا ہے اس نے خود زبردستی لے لیا ہے۔ نیم حسین اس لئے کہ کامل حسن صرف دوشیزہ ہی میں ہوتا ہے تم کہو گے کہ

اپنے سے آٹھ برس بڑی ہیروئن کیوں پسند کی۔ اس کا جواب میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں نے کسی کو پسند نہیں کیا۔ اور اگر کوئی تمہارے کاہل دوست ہی کو پسند کرلے تو اس میں میرا کیا قصور۔

جیات خوش نہ ہو نا کہ تمہاری پیشین گوئی پوری ہو گئی ——

میرا دل ابھی تک عشق سے ویسا ہی نا آشنا ہے جیسا کہ تمہارے ساتھ رہتے ہوئے تھا۔ اگر کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے تو کرے یہ ضروری نہیں کہ مجھے بھی اس سے محبت ہو گی۔ اور اگر کسی کی تکلیف میں میں نے ہمدردی ظاہر کی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے عشق ہے۔ ان دو فقروں کو یاد رکھنا۔ آگے چل کر یہی فقرے تمہیں بدگمانی جیسے —— ایک زبردست اخلاقی گناہ سے بچائیں گے۔

تم نے ہمارا یہ مکان نہیں دیکھا۔ ورنہ اس کا حدود اربعہ بیان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یوں تو مہینے میں تم دو ایک دفعہ دہلی آجاتے تھے۔ لیکن جب سے میں اس مکان میں آیا ہوں ایک مرتبہ بھی نہیں آئے۔ اب بالاخانے پر رہتا ہوں۔ مشرق مغرب (دائیں بائیں) میں دونوں طرف بالاخانے ہیں۔ اور جنوب میں پشت کی طرف بھی شاید بالاخانہ ہی ہے اس کے متعلق نہ میں نے کبھی خیال کیا اور نہ ضرورت ہی پڑی۔ شمال میں یعنی سامنے میدان ہے۔ اور نیچے کے مکان میں حال ہی میں افریقہ سے خوبصورتی کا تمغہ لے کر ایک "حسین" خاندان آکر آباد ہوا ہے۔ مردوں کا تو کہنا ہی کیا عورتیں ظالم بھی کھلے بندوں بے نقاب پھرتی رہتی ہیں۔ اتنا خیال نہیں کہ کسی کی اتفاقیہ نظر پڑ گئی۔ تو غریب پر مصیبت آجائے گی۔ کم از کم ایک بار تو ضرور کھایا پیا سب

نکل جائے گا۔ دایاں بالاخانہ خالی پڑا ہے۔ پہلے بایاں بھی خالی تھا مگر اب تقریبًا ایک مہینے سے آباد ہو گیا ہے۔ خالی والے اور ہمارے بالاخانے کا زینہ ایک ہے۔ اور بائیں بالاخانے کا زینہ دوسرا ہے اور ہمارے اس کے صحن کو ایک چھوٹی سی دیوار دو حصوں میں منقسم کرتی ہے۔ اس چھوٹی سی دیوار ہی نے واقعات کو یہ رنگ دیا ہے اگر یہ دیوار دو ایک فٹ اور اونچی بنا دی جاتی تو شاید آج صورتِ حالات یہ نہ ہوتی۔ لیکن مکان کے مالکوں کو تو کرایہ سے غرض ہے۔ ان کی بلا سے اگر کرایہ داروں کو کچھ تکلیف ہو تو ہوا کرے۔ اس بالاخانے میں ایک مسلمان بزاز رہتا ہے۔ صبح کو آٹھ بجے دوکان پر جاتا ہے تو رات کو دس بجے سے پہلے لوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی بیوی انتہا درجہ کی فیشن کی دلدادہ ہے۔ آٹھ پہر بناؤ سنگار کرتی رہتی ہے۔ گو دو ننھے ننھے بچے بھی ہیں۔ پھر بھی اس کی زیبائش میں فرق نہیں آتا اس قسم کی عورت کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زیبائش پر جان دے اس کی مدح خوانی کرے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ آتا ہے اور کھانا کھا کر لیٹ جاتا ہے۔ ـــــ خیر مجھے کسی کے ڈھکے چھپے بکھیڑے کھولنے کا کیا حق ہے۔

کئی روز تک یہ دیوار پر سے جھانکتی رہی۔ جب میں نظر اوپر اٹھاتا تو فورًا سر نیچا کر لیتی۔ کئی مرتبہ میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر کارگر نہ ہوئی۔ ایک جھلک ـــــ اور اس کے بعد معاملہ صاف اتوار کا دن تھا۔ مجھے حجامت بنانی تھی۔ صحن میں میز کرسی بچھائی اور اس دیوار کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ میز کرسی کے کھینچنے کی آواز سے

وہ دیوار کے قریب آگئی اور میز کے آئینہ میں اس کا عکس پڑنے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ کر قطعی نہ دیکھا۔ آہستہ آہستہ حجامت بناتا رہا۔ شیشے میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنی بچی کو آواز دی اور کچھ کام کرنے کے لئے کہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں مڑ کر دیکھوں۔ لیکن میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ جب حجامت بنا چکا تو ایک دفعہ اور گالوں کو صابون لگایا اور دوسرے استرے سے جھاگ صاف کرنے لگا۔ اس نے بھی نقل کی۔ گالوں کے قریب ہاتھ لے جا کر ایسے ہلانے لگی جیسے صابون لگاتے ہیں اور اس کے بعد شہادت کی انگلی پھیرنے لگی۔ اس کی اس شرارت پر مجھے ہنسی آگئی اور استرے نے فوراً اس ہنسی کی سزا دی لیکن کچھ تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ استرا میرے لگا تھا۔ اور آہ اس نے کھینچی تھی۔ میں برابر ہنستا رہا۔

اس دن کے بعد اکثر دیوار کی دوسری طرف سے ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کی آواز آیا کرتی اور کبھی کبھی عشقیہ اشعار سنائی دیتے لیکن میں نے کوئی توجہ نہ کی۔ ایک شام انگنائی میں بیٹھا وضو کر رہا تھا ایک پرچہ قریب آکے پڑا۔ اٹھا کے پڑھا تو حیران ہو گیا۔ رحم کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے کسی پر ظلم کیا تھا۔ جو رحم کرتا۔ اس پرچے کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے دن پھر اسی وقت دوسرا پرچہ آیا۔ پہلے کا جواب مانگا تھا۔ اور کچھ کچھ عشق کا اظہار بھی کیا تھا تیسرے دن پھر چھٹی تھی۔ دوپہر کو بیٹھا ہوا "ہمایوں" کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ اس کی ننھی لڑکی نے اپنی طرف منعطف کر لی۔ اس کی والدہ نے اٹھا کر اسے دیوار پر بٹھا دیا تھا اور وہ اپنے ننھے ننھے اور ادھ

اُودے سے لب ہلا رہی تھی۔

"بابوجی زور زور پڑھو ـــ ہم بھی سنیں گے۔"

میں نیچی نظریں کئے ورق گردانی کرتا رہا۔ لڑکی نے پھر یہی درخواست کی کیونکہ اس سے ایسا کرنے کے لئے دوبارہ کہا گیا تھا میں نے مارچ کا "ہمایوں" فائل میں سے نکال لیا اور اپنا افسانہ "تردد" اتنی بلند آواز سے پڑھنے لگا کہ وہ آسانی سے سن سکے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید چلی گئی۔ بچی کو تو اس نے افسانہ شروع کرنے کے ساتھ ہی ہمسائی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اور دیوار کی دوسری طرف کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن میں اسی طرح پڑھتا رہا۔ افسانہ ختم ہونے پر بھی کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔ میں سمجھا کوئی عورت آگئی ہوگی اور ملازم کو کھانے کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا۔ توقع کے خلاف بہت جلد واپس آگیا۔ ظہر سے پہلے گیا تھا۔ وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ میری آواز سنتے ہی فوراً دیوار کے قریب آکر جھانکنے لگی۔ اتفاقاً ملازم خود بخود بازار چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی کہنے لگی۔

"وہ کتاب ذرا مجھے دیدیجئے۔"

"کونسی کتاب" میں نے پوچھا۔

"جس میں سے کہانی پڑھ کر سنائی تھی۔"

اس کے چہرے سے اور آواز سے بہت زیادہ رنج کے آثار نمایاں تھے آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی نمی موجود تھی میں نے محسوس کیا کہ یہ اُس وقت سے رو رہی ہے اور مجھ پر بھی آیا کہ اسے ایسا غمناک قصہ کیوں سنایا۔

قصہ مختصر اب وہ مجھ سے قطعی بے تکلف ہوگئی ہے۔ گھنٹوں کھڑی باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی جب میں اُس کے حُسن کی تعریف کر دیتا ہوں تو خوب مزا آتا ہے۔ بات کہتے کہتے چپ ہوجاتی ہے اور نظریں نیچی کرلیتی ہے۔ چہرے پر حیا کی اور شاید خوشی کی سرخی دوڑ جاتی ہے خاموش کھڑی رہتی ہے اور مدہوش —— جب میں اپنا قصیدہ ختم کرلیتا ہوں تو اکثر کہتی ہے۔ "میں اس قابل کہاں ہوں کہ آپ میری تعریف کریں"۔

ایک دن اس نے مجھ سے ایک عجیب درخواست کی۔ کہنے لگی "اپنے ملازم کو علیحدہ کر دیجئے"۔ میں نے کہا "کیوں؟ اور کھانا کون پکائے گا؟"

"کھانا کون پکائے گا"۔ اس نے میرے سوال کو دھرایا پھر بولی۔ "جب تک میرے دم میں دم ہے آپ کو کھانے کا کیا فکر"۔

میں نے کہا۔ "نہیں یہ ٹھیک نہیں"۔

"کیوں" اس نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں کہتا ہوں"۔ مجھے کوئی اور جواب نہ بن پڑا۔

"اس لئے کہ میں کہتا ہوں"۔ اُس نے لبوں ہی لبوں میں یہ الفاظ کہے اور سر نیچا کرلیا۔

حیات! کیا تمہارا کاہل دوست اس قابل ہے کہ اس سے عورت محبت کرے۔ اس پر صنف نازک کی ایک دلفریب ہستی جان دے —— نہیں —— پھر اس بدنصیب کو کیا ہوگیا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا طویل خط لکھا ہے اچھا۔ رخصت ——

دوسرا خط

سات دن ہوئے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ابھی تم اس کا جواب دینے کے متعلق غور کر رہے ہو گے کہ میں دوسرا خط لکھنے بیٹھ گیا۔ تہیّہ کر لو جب تک میرے اتنے خط تمہارے پاس نہ پہنچ جائیں۔ جتنے تم نے مجھے لکھے تھے۔ جواب نہ دینا۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔ تم محبّت کی داستان سنو اور خاموش رہو ناممکن ہے۔

حیات! زندگی میں اگر کچھ دلچسپی ہے تو عورت کے پیار سے متعلق ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں زندگی سے کس درجہ متنفر تھا۔ میرے نزدیک زندگی رنج سہنے اور صدمے اٹھانے کا نام تھا۔ ایسے رنج اور صدمے جن کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا لیکن اب مجھے زندگی میں مسرتیں نظر آتی ہیں ایسی مسرتیں جن کے خیال سے ہی کیف محسوس ہوتا ہے اور سرور۔ کشمکش میری زندگی میں ایک انقلاب کی محرک ہوئی ہے۔ گو مجھے یقین ہے اور شاید اسے بھی کہ یہ "انقلاب" اُس کے لئے کچھ سودمند نہ ہوگا۔

میں نے اُس کا نام کشمش تجویز کیا ہے۔ کیونکہ وہ کشمش بہت کھاتی ہے۔ اور اب تو مجھے بھی بہت کھلاتی ہے۔ جب دیکھو جیب میں کشمش بھری ہے۔ اور منہ چل رہا ہے۔

کل ہم سینما دیکھنے گئے تھے کشمش کا شوہر دس بجے گھر آتا ہے۔ اور پہلا کھیل نو بجے سے پیشتر ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے شام سے ہی ترکاری پکالی اور آٹا گوندھ کر رکھ لیا۔ میں نے کہا "روٹیاں پکالو"

کہنے لگی "ٹھنڈی ہو جائیں گی" وہ کہیں گے کہ "روٹیاں تو مغرب سے پہلے کی پکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد گیا کرتی رہیں۔

میں اس سے تقریباً دس منٹ پہلے چلا گیا۔ اور سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا کہ وہ بھی آ گئی۔ ہم نے تانگہ کرائے کیا۔ اور سینما پہنچ گئے۔ میں ٹکٹ خریدنے کے لئے جانے لگا تو اس نے روپے پیش کئے میں نے کہا کہ میرے تمہارے روپے ایک ہی ہیں۔ وہ بولی پھر کیا حرج ہے یہی لے جاؤ۔ میری مرضی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خریدنے کی تھی لیکن اس کے کہنے سے بکس کے لئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور چار آنے والوں نے شور و غوغا سے سارے ہال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے تماشہ شروع ہوا۔ خاصہ دلچسپ کھیل تھا۔ اور سبق آموز۔ تمہارے لئے نہایت مختصر الفاظ میں اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

"ایک شخص اکرام نامی اپنے دوست کی بیوی پر عاشق ہو جاتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کی محبوبہ اس کے محبوب ترین دوست کی شریک زندگی ہے۔ وہ اپنے عشق کا حال اپنے دوست سے کہہ دیتا ہے اور جس جگہ اور جس حال میں سے دیکھا تھا وہ بھی بتا دیتا ہے۔ دوست بظاہر مطمئن نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے دلی جذبات پر غلبہ پا لیتا ہے۔ اور اپنے دوست سے کہتا ہے۔ فکر نہ کرو آج رات اس پری وش کو تمہارے کمرے میں حاضر کر دوں گا۔ وہاں سے جا کر وہ اپنی بیوی سے یہ انوکھی درخواست

کرتا ہے بیوی راضی نہیں ہوتی۔ لیکن شوہر کی ضد پہ خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ خود جاکر اسے اکرام کی خوابگاہ میں چھوڑ آتا ہے اور ننگی تلوار لے کر باہر پہرہ دیتا ہے۔ اکرام دوست کی بیوی کو ہاتھ لگاتا ہے۔ وہ اسے حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہے۔ اکرام یہ راز سن کر اسے بہن کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور پاؤں میں گر کر معافی مانگتا ہے۔ پھر سوچتا ہے کہ جن ہاتھوں نے دوست کی زوجہ کو بُری غرض سے مس کیا ہے انھیں ضرور کاٹنا چاہیئے۔ یہ خیال کر کے وہ باہر آتا ہے اور دوست سے کہتا ہے کہ جب میں اس حسینہ کے قریب جاتا ہوں تو دیواروں سے دو ہاتھ نکلتے ہیں۔ اور مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے دوست اس کے ہمراہ کمرے میں جاتا ہے اور کہتا ہے "چراغ گل کر کے تم آرام کرو میں یہاں پہرہ دوں گا۔" اکرام موقع پاکر باہر چلا جاتا ہے۔ اور دیوار کے روزن سے اپنے دونوں ہاتھ اندر کی جانب نکالتا ہے۔ دوست ہاتھ دیکھتے ہی تلوار چلاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کٹ کر گر پڑتے ہیں۔ ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ باہر جاکر دیکھتا ہے کہ اکرام بے ہوش پڑا ہے۔ حیران ہے کہ کیا معاملہ ہے اتنے میں بیوی آجاتی ہے اور سارا واقعہ بیان کرتی ہے۔"

اس کے بعد خبر نہیں کیا ہوا۔ ہم اٹھ کر چلے آئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ "وقفہ" میں میں نے جو نیچے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کشمش کے سرتاج تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کشمش سے پوچھا "انھیں پہچانتی ہو یہ کون ہیں؟" اس نے دیکھا اور سہم گئی۔ پھر بولی "یہ کہاں سے آگئے؟" اور گھر چلنے کی رٹ لگا دی۔

میں چاہتا تھا کہ کھیل ختم ہونے پر چلیں۔ لیکن مصلحت فوراً روانہ ہونے ہی میں تھی۔ بچہ بھی رونے لگا تھا۔ لہذا کھیل ختم ہونے سے تقریباً بیس منٹ پہلے واپس چلے آئے۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں اُس کے شوہر کو پتہ نہ چل گیا ہو کہ ہم یہاں آئے ہیں۔ لیکن میں نے تسلی دی کہ نہیں یہ یونہی چلے آئے ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا یہی بات تھی۔ حضرت نے گھر آکر سینما جانے کا ذکر تک نہیں کیا۔ کشمش کے دریافت کرنے پر کہ آج دیر کہاں لگی۔ کہنے لگے "آخری وقت میں گاہک آگئے تھے"۔

حیات! کتنی عجیب بات ہے۔ میاں بیوی دونوں ایک تماشہ دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک ہی سینما گھر میں اور ایک ہی وقت میں۔ مگر ایک دوسرے کو نہیں بتاتے اور دونوں محبت کے دعوے دار ہیں۔ کیا یہ بزاز صاحب کی غفلت کا نتیجہ نہیں کہ اُن کی رفیقِ زندگی غیر مرد کے ساتھ تماشے میں گئی۔ اور کیا یہ اُن کی بے رُخی کا انجام نہیں کہ ان کی شریکِ حیات نامحرم سے محبت کرتی ہے، جتنا اعتبار وہ کرتے ہیں کہاں تک درست ہے۔ کیا محبت میں کبھی شبہ کو دخل نہ دینا چاہئے اگر یہ کبھی کبھی دُکان کو چھوڑ کر وقت بے وقت گھر کی خبر لیا کرتے تو شاید واقعات اس سُرعت کے ساتھ ظہور پذیر نہ ہوتے لیکن انھیں تو دُکان سے غرض ہے اور روپے سے بیوی کی پروا نہیں ——

حیات تم کہوگے کہ دوسروں کو نصیحتیں کرنی آتی ہیں۔ اپنی بُرائیوں پر نظر نہیں کرتے۔ دوست ٹھیک کہتے ہو یہ بھی گناہ ہے۔ لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے بچتا ہوں اور جو کچھ تمہیں لکھ چکا ہوں اس حد سے زیادہ نہیں بڑھا۔ شاید تمہیں یہ پڑھ کر حیرت ہو گی کہ آج تک اُس کے

بدن سے میں نے اپنی انگلی تک مس نہیں ہونے دی۔ خیر صفائی کی ضرورت نہیں۔ اگر تم کچھ بُرا خیال کرو گے تو تمہارے آگے آئے گا۔

تیسرا خط

ابھی ابھی تمہارا "حماقت نامہ" پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کبھی لاہور کے مشہور مقام کو تمہاری قدمبوسی کا شرف حاصل نہ کرنا پڑے۔

تم کہتے ہو کہ وہ "زرّین زمانہ" ایک مرتبہ اور آئے گا اور ہمیشہ رہے گا۔ تمہاری مراد بہشت سے ہے۔ وہاں بھی ہم معصوم ہوں گے اور بے فکر اور دل شاد۔ لیکن کہتے ہو وہ تمہارے لئے ہو گا۔ میں اُس سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ خوب! حیات یاد رکھو اگر ہم سب دوستوں میں سے کسی کو بہشت ملی تو انشاءاللہ خاکسار ہی کو ملے گی۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں میرا جی نہ لگے اور میں اللہ میاں کی منتیں کر کے تمہیں بھی اپنے پاس بلا لوں۔

تم میرا "افسانۂ محبت" سننے کے لئے بے تاب ہو۔ کیوں؟ تم تو کہتے ہو کہ آگ سے نہیں کھیلنا چاہئے اور خاص طور پر جب کوئی مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے۔ حیات تمہارے خیال میں میں آگ سے کھیل رہا ہوں، عورت کو تم آگ کہتے ہو یہ صنعتِ نازک کی سخت توہین ہے۔ عورت دنیا کی زیبا کُش ہے۔ عورت

خدا وند تعالیٰ کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ عورت نے دنیا میں بڑے مصلح، قائد، ولی اور پیغمبروں کو جنم دیا۔ عورت نے دنیا کو معراجِ ترقی پر پہنچایا۔ عورت سے زندگی کی دلچسپیاں وابستہ ہیں اگر عورت نہ ہوتی تو دنیا کی ہر چیز نامکمل رہ جاتی۔ اور کسی شئے میں حسن نظر نہ آتا۔ ظلمت کا رواج ہوتا اور نور کا کہیں پتہ نہ چلتا۔ پھر تم عورت کو آگ کیسے کہتے ہو۔ اگر آگ ہی ہے تو ٹھنڈی آگ ہے۔ روشنی پہنچاتی ہے۔ جلاتی نہیں۔

"اگر مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے۔" اس مطلب پرستی نے ہندوستان کو تباہ کر دیا۔ کاش یہ الفاظ لکھتے ہوئے تمہارا قلم ٹوٹ جاتا۔ مجھے اس ایک فقرے کو پڑھ کر اتنا رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک طرف تم محبت کی توہین کرتے ہو۔ دوسری طرف عورت کی۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ آئندہ تمہیں کشمش کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ مفت میں ناراض ہو جاؤ گے۔ اچھا سنو فسانۂ الفت سنو اور اگر خدا توفیق دے تو نیک سبق حاصل کرو۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ملازم بیمار ہو گیا اور مجھے مجبوراً اسے چھٹی دینی پڑی۔ دو وقت تو بازار میں کھانا کھایا لیکن کشمش نے بہت بُرا مانا۔ اور قسم کھا کر کہنے لگی کہ اب آپ جب تک بازار میں کھانا کھائیں گے مجھے بھی کھانا پینا حرام ہے۔ دو تین وقت میں نے اور ٹال دیئے بلتستت میں کھانا رکھ کر دیوار پر سے دینے لگی۔ مگر میں نے نہیں لیا۔ اس کے بعد کچھ نہ بولی اور بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ مجھے اس کی لڑکی کی زبانی

اس بات کی خبر ہو گئی۔ اور خود کہنا پڑا کہ شام کا کھانا میں آپ کے یہاں کھاؤں گا۔

حیات! وہ نظارہ بھی خوب تھا۔ دیوار کو ہم نے میز بنا رکھا تھا ایک جانب کرسی پر وہ کھڑی تھی اور دوسری طرف میں اور ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ گو سرد ہوا چل رہی تھی۔ پھر بھی پسینہ سا آرہا تھا۔ یہ میری مختصر حیات میں پہلا واقعہ تھا کہ میں ایک نامحرم عورت کے ساتھ کھانا تناول کر رہا تھا۔ بدن میں ہر دو تین لمحوں کے بعد سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی اور دل کو ایک عجیب سرور حاصل تھا۔ وہ مارے خوشی کے کھلی جاتی تھی۔ بات بات میں ہنس رہی تھی۔ یوں تو سینکڑوں دفعہ کھائی ہوں گی مگر جو لطف اس دن آیا کبھی نہ آیا تھا۔ اُس دن سے دونوں وقت کھانا طشت میں لگا کر دیوار سے پکڑا دیتی ہے۔ ہر چند کہتا رہتا ہوں کہ تم مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ بس اب میرے لیے کھانا نہ پکانا۔ مگر وہ ایک نہیں سنتی اور ہمیشہ اچھے سے اچھا پکاتی ہے۔ آجکل وہ وہ چیزیں کھا رہا ہوں کہ تم نے ان کے نام بھی نہ سُنے ہوں گے۔

چوتھا خط

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں کشمش کی طرف سے تمہارے خیالات اتنے بُرے کیوں ہو گئے۔ وہ اتنی بری نہیں جتنا کہ تم خیال کرتے ہو اسے مجھ سے محبت ضرور ہے اس کا میں بھی اعتراف

کرتا ہوں۔ مگر بے لوث محبت ہے اس کی تہہ میں کوئی غرض یا مطلب پنہاں نہیں اور مطلب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ مالی حالت ان کی مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں پھر ایک کلرک ہی ہوں اور وہ تاجر۔ دو تین دن ہوئے اس نے مجھے نہایت قیمتی فیروزے کی ایک سنہری انگشتری دے دی ہے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ایسا قیمتی تحفہ اسے دینے کو نہ تھا۔ اس لئے میں نے لینے سے انکار کیا۔ مگر اس نے ہر دلیل کی تردید کی اور مجھے وہ انگوٹھی قبول کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ اس نے ایک درخواست بھی کی۔ ”جب آپ کی شادی ہو جائے تو یہ انگوٹھی میری طرف سے اپنی بیوی کو دے دینا۔“

میں نے کہا ”ہرگز نہیں اسے تو میں ہر وقت اپنی انگلی میں رکھوں گا۔ اور آنکھوں کے سامنے۔“ کہنے لگی ”آپ کو اختیار ہے۔ میں تو اپنی درخواست عرض کر چکی۔“

میں خود اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر ابھی کامیاب نہیں ہوا، اس کی باتیں —— محبت بھری اور پیاری باتیں۔ اس کا حُسن سلوک اور اس کی محبت میرے لئے ایک معمّا ہے۔ کبھی کبھی میں بدگمان ہو جاتا ہوں مگر پھر یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ میرا دل بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

گئی جمعرات کا ذکر ہے کہ اُس نے کہا ”تم مضمون لکھتے ہو۔“

”نہیں تو۔ کون کہتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”مگر پڑھتے کیوں ہو؟ تم نے خود مجھے اپنا افسانہ پڑھ کر سنایا تھا اور اس کے بعد میں نے تم سے جتنے رسالے مانگے ان سب میں

تمہارے مضمون تھے۔"
"پھر تم کیا چاہتی ہو؟"
"میں کیا چاہتی ہوں" اس وقت بتاؤں گی اگر تم یہ وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اسے ضرور پورا کرو گے۔"
میں نے وعدہ کر لیا تو بولی۔"تم مردوہ کام کرتے ہو جس میں یا تو تمہاری ہی جنس کو فائدہ پہنچے یا بالکل فضول ہو۔ عورتوں کیلئے تم کچھ نہیں کرتے اور تمہارے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔"
"کیوں عورتوں کے لئے میں کیا نہیں کرتا ——— تمہاری رائے میں مجھے اور کیا کرنا چاہیئے؟"
"تم نے ابھی کیا ہی کیا ہے۔ تعلیم ہی کو لیجئے۔ سو میں مشکل سے دس پڑھی ہوئی ملیں گی۔ تم نے کبھی اس کے متعلق قلم اٹھایا۔ ہماری صحت کا تم نے کیا خیال کیا۔ کیا ہماری تقدیر میں صرف یہ چار دیواریں ہی رہ گئی ہیں۔ جسے دیکھو وہی بیمار ہے۔ جسے دیکھو اُسی کا رنگ زرد ہے تمہیں تمہارے دلچسپ مشغلے اس طرف توجہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ تم ساری قوم کو کمزور اور جاہل بنا رہے ہو۔ بیمار اور ضعیف ماؤں کے بچے کہیں تندرست اور طاقتور ہو سکتے ہیں۔ اور ان پڑھ ماؤں کی اولاد بھی کبھی مہذب ہو سکتی ہے؟"
کچھ دیر کی پُر لطف بحث کے بعد میں نے مکرر وعدہ کیا کہ آئندہ جو کچھ لکھوں گا۔ جنسِ لطیف کے مفاد کے لئے لکھوں گا۔ کشمش نے شکریہ ادا کیا۔
جیات! میں تمہیں اتنے بڑے بڑے خط لکھتا ہوں اور تم مجھے شاہ آباد کی

خاص خاص ہستیوں کے حالات سے بھی مطلع نہیں کرتے۔ تمہیں تو افسانہ سننے کی پڑی ہے اور یہ چاہتے ہو کہ ایک ہی دن میں ختم کر دیا جائے۔ خیال تو کرو کہ میرے پاس کیا لکھا رکھا ہے۔ جو اٹھا کر ڈاک میں ڈال دوں۔ جب کوئی بات ہوتی ہے تو میں تمہیں ضرور لکھتا ہوں۔

پانچواں خط

نہ جانے تمہاری تحریر میں یہ اثر کہاں سے آ گیا۔ تم روز بروز میرے دل میں کشمش کی طرف سے زیادہ ہی زیادہ شبہ پیدا کر رہے ہو۔ جب تمہارا خط آتا ہے اس وقت تو خاص طور پر میں اُسے "سراپا معصیت" سمجھنے لگتا ہوں۔ لیکن پھر کشمش اپنی دلفریب باتوں اور بے غرض محبت سے حوروں سے زیادہ معصوم معلوم ہونے لگتی ہے۔

آج میں نے دفتر آنے سے پہلے ایک حماقت کی۔ اس سے کہا "ایک بات پوچھوں اگر تم بُرا نہ مانو۔"

"پوچھو"۔ اُس نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا۔ "شوق سے پوچھو۔"

اور خبر نہیں کیوں ——— میں نے اُس سے سوال کیا۔ "تم نے اب تک کتنوں سے محبت کی ہے؟"

"مَیں نے ——— اب تک ——— کتنوں سے ——— محبت کی ہے۔" اس نے رُک رُک کر اور اٹک اٹک کر کہا۔ ذرا دیر سوچتی رہی

شاید سوال کی اہمیت پر غور کر رہی تھی اور فوراً نیچے بیٹھ گئی، میں نے کچھ خیال نہ کیا اور دفتر چلا آیا۔

حیات! تمہاری تحریر نے یہ گل کھلایا ہے۔ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو۔ دفتر میں بیٹھا ہوں اور دل کشمکش میں پڑا ہے۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میں نے اس کے دل کو صدمہ کیوں پہنچایا۔ جب کہ وہ میرا اس قدر خیال کرتی ہے اور مجھے ہر طرح سے آرام پہنچانے کی تدبیریں سوچتی رہتی ہے۔

میری بھی یہی دلی خواہش ہے کہ خدا ریاضت کو کسی بڑے عہدے پر مامور کر دے۔ ان حضرت نے ناز و نعمت میں آنکھیں کھولیں چاؤ چونچلوں میں پلے۔ اور عیش و عشرت میں جوان ہوئے۔ اب یہ کوئی سخت کام نہیں کر سکتے، انھیں اُداس اُداس دیکھ کر میرا بھی دل کڑھتا ہے۔ اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ابھی یہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوئے تھے کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ لیا اور پھر ان کی مفارقت کے زخم بھرنے نہ پائے تھے کہ والدہ کے لطف و کرم سے محروم کر دیا۔ ان ناقابل برداشت صدموں کی تلافی اُس وقت ہی ممکن ہے کہ اِنھیں کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے۔ اور یہ پہلی سی بے فکری اور فضول خرچی سے زندگی بسر کرنے لگیں۔

چھٹا خط

غضب ہو گیا حیات! غضب ہو گیا۔ اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا، اب تم اطمینان کا سانس لو گے۔ اس مرتبہ اور "روداد غم" پڑھ لو۔ اس کے بعد میں تمہیں کچھ نہ لکھوں گا۔ یہ سب کچھ کیا دھرا تمہارا ہی ہے۔ نہ تم مجھے اکساتے نہ میں اس سے ایسا سوال کرتا اور نہ یہ سانحہ ـــــ یہ جانگداز سانحہ وقوع میں آتا۔

اُس روز شام کو دفتر سے واپس آیا تو کسی کو اپنا منتظر نہ پایا ورنہ جب میں آتا تھا تو ہمیشہ کھڑی انتظار کرتی ہوتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اور صحن میں بوٹوں سے آواز پیدا کر کے پھرنے لگا۔ پھر یونہی کھانسنے لگا لیکن بے سود۔ دروازے کو کھڑکے سے بند کرتا اور پھر اس سے زیادہ زور کے ساتھ کھولتا۔ اپنی آمد کی مختلف طریقوں سے اطلاع کرنے پر کسی کی آواز سنائی نہ دی اور نہ کوئی دیوار پر سے جھانکا۔ تو میں دبے پاؤں دیوار کے قریب گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اس طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ میں سہم گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ دوسری جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا صحن میں جتنی چیزیں تھی سب بے قرینہ پڑی تھیں اور ہر شئے سے رنج و غم برستا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت مجھے سوال کی نوعیت کا خیال آیا اور میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کرسی انگنائی میں نکال کر بیٹھ گیا۔ اور غور کرنے لگا۔ غور کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یا تو وہ آج ہی آجائے گی اور یا پھر اس مکان میں کبھی نہ آئے گی ـــــ بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو سیر کرنے چلا گیا۔ سیر میں بھی کچھ لطف

نہ آیا۔ لیکن میں بڑھتا چلا گیا۔ اور بڑی دیر بعد واپس آیا۔ آکر دیکھا اُن کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو خوب زور سے بند کیا۔ اور صحن میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ نہ کشمش دیوار کے قریب آئی۔ نہ اُدھر ہی سے کوئی بات کی ٹہلتے ہوئے چار پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ آہستہ آہستہ رونے کی آواز آئی۔ میں ساکت وصامت دیوار سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا شوہر کہہ رہا تھا "تمہیں ہوا کیا خود بخود کیوں رونے لگیں"۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا اور زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگی۔ روتی رہی حتیٰ کہ سسکیاں بھرنے لگی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ شوہر کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ کیا کرے۔ آخر لڑکی سے پوچھا "بیٹا آج یہاں کوئی تمہاری ننھیال سے آیا تھا۔ تمہاری اماں کو کیا ہو گیا"۔

"صبح بابو جی نے کچھ کہا تھا اس وقت سے رو رہی ہیں۔ پھر ڈولی میں ہم نانی اماں کے گئے تھے وہاں بھی روتی رہیں"۔

غریب لڑکی بھی پریشان ہو گئی تھی۔ پریشانی ہی میں اُس نے اپنی ماں کے بہت اہم راز کو افشا کر دیا تھا۔ اور اسے معلوم بھی کیا تھا کہ یہ بات کہنے سے کیا ہو گا۔

"کون بابو جی" ابا نے پوچھا۔

"یہ جو اس طرف رہتے ہیں"۔

"تمہاری اماں اُن سے باتیں کرتی ہیں؟"

"ہاں ——— نہیں کرتی" لڑکی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے کشمش کا خیال تھا کہ غریب پر

کیسی مصیبت آئی۔ میرا کیا تھا۔ مجھے وہ کیا کہہ سکتا تھا اور زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ سب کچھ میری بے وقوفی سے ہوا تھا۔ نہ میں اس سے وہ سوال کرتا۔ نہ واقعات یہ صورت اختیار کرتے۔ آکر کمرے میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں دوبارہ سسکیوں کی آواز آئی۔ پھر باہر جا کر دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔ جتنا زیادہ واقعات کی اہمیت پر غور کرتا تھا۔ اتنا ہی دل کو رنج پہنچتا تھا۔ بارہ بجے تک یہی حالت رہی۔ کبھی رونے کی آواز آتی اور کبھی سناٹا چھا جاتا۔ بارہ بجے کے بعد قطعی خاموشی ہوگئی شاید وہ سو گئے تھے۔ لیکن حیات اس رات میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا۔ ساری رات قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔

خیال تھا کہ صبح کو ملاقات ہو گی تو معافی مانگ لوں گا۔ لیکن اُس کا خاوند اُس روز دُکان پر نہ گیا۔ میں بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ جائے تو کشمش سے بات کروں۔ آخر پونے دس بج گئے اور مجھے دفتر بھاگنا پڑا۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا گو سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے اس وقت بھی کچھ نہ کھایا۔

دفتر کے کام میں، رنج میں اور شام کی ملاقات کی امید میں دن تمام ہو گیا۔ اس بات کا خاص طور پر صدمہ تھا کہ میری وجہ سے کسی کو کیوں رنج پہنچا۔ چار بجے سے پہلے ہی ہیڈ کلرک سے اجازت لے کر چل پڑا۔ گھر پہنچا تو پھر دیوار کو خالی پایا۔ انگنائی میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا آج اُس نے قطعی دُکان نہیں کھولی ورنہ کشمش رکنے والی نہ تھی۔ کئی دفعہ جی میں آیا کہ لڑکی کو آواز دوں پھر اس کے والد کے خوف سے چپ ہو رہا کہ جو کچھ رات لڑکی نے کہا تھا۔ اُس کا اسے

بالکل یقین آجائے گا۔ انتظار کرتے کرتے خاصی دیر ہو گئی۔ لیکن ادھر سے کوئی آواز نہ آئی نہ بات کرنے کی نہ بچوں کے بولنے کی اور نہ کسی کے چلنے پھرنے کی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ دبے پاؤں دیوار کے نیچے گیا اور آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھانے لگا۔ دوسری طرف جھانکنے لگتا کہ پھر سر نیچا کر لیتا۔ آخر ایک مرتبہ دل کڑا کر کے دوسری جانب دیکھ ہی تو لیا —— کیا دیکھا؟ قلم میں اس کے بیان کی طاقت نہیں۔ پہلی بار مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ دوبارہ دیکھا —— کمرے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ اور وہاں نہ کشمش تھی نہ کشمش کی کوئی چیز ——

حیات یقین مانو کہ مجھے اس سے عشق نہ تھا۔ لیکن ان کے اس طرح چلے جانے پر میرے دل کو بے انتہا صدمہ پہنچا اور میں بغیر کسی خاص ارادے کے جنگل کی طرف چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کب واپس آیا صبح کو جب آنکھ کھلی تو اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں کشمش کے لئے سوگوار ہوں۔ اور یہ بھی یقین ہے کہ زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت، اس سے زیادہ حسین، اس سے زیادہ دلکش عورتوں سے پالا پڑے گا۔ لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سینے میں بیٹھا کلیجہ مسل رہا ہے۔ گو مجھے اس سے معافی مانگنی نصیب نہیں ہوئی لیکن میں اپنی خطا پر سخت پشیمان ہوں۔ آسمان، چاند، تارے، زمین، پتھر، چٹانیں، گھاس اور درخت سب گواہ ہیں میں پشیمان ہوں اور ان سب نے مجھے اپنی غلطی پر آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

ساتواں خط

تم اپنے آپ کو بے خطا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ لیکن نہیں کر سکتے تم ہزار ثبوت پیش کرو۔ مگر میں ایک نہ مانوں گا۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں بہکایا۔ بلکہ کشمش کے دل پر بھی ایسا چرکا لگایا ہے کہ جیتے جی تمہیں دعائیں دے گی۔ اب معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہو چکا۔ ہو چکا۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔

تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ خط لکھتا رہوں اور یہ داستان جو اب حد درجہ ناگوار ہو گئی ہے سناتا رہوں۔ حیات اگر داستان سننی تھی تو کشمش کو خط کیوں لکھا تھا۔ تم تو مجھے اس کے پنجے سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن میں تو اور گرفتار ہو گیا۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے میں نے اس طرف پھر دیکھا دیوار پر ایک نئی اینٹ رکھی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اس کے نیچے ایک پرچہ ملا۔ یہ کشمش کا خط تھا اور اس کے ساتھ تمہارا خط نتھی تھا! اب میں اس کے رونے اور بے قرار ہونے کا سبب سمجھا۔ بھلا تم نے جھوٹ بول کر کیا لیا۔ خدا تمہیں اس "نیک کام" کا اجر دے۔

اب پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ زندگی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دفتر جاتا ہوں تو وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گھر آتا ہوں تو در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اسی وحشت میں قدسیہ باغ یا کسی دوسری سیرگاہ میں چلا جاتا ہوں مگر وہاں وحشت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ نوجوان مرد خوبصورت اور حسین عورتوں کو

بغل میں لئے مٹر گشت کرتے نظر آتے ہیں! ایسی خوبصورت اور حسین عورتوں
کو جن پر ایک دفعہ نظر پڑنے کے بعد انسان متاعِ راحت و آرام کھو بیٹھتا ہے
جی چاہتا ہے کہ میں بھی کسی رشکِ حور کو ساتھ لے کر ان باغوں
کی سیر کروں۔ ان خوشنما روشوں پر اکڑ اکڑ کر چلوں اور ہر بے عورت کے مرد کو
حقارت کی نظر سے دیکھوں۔ علاوہ ازیں جب کسی حسین عورت کو بدصورت
مرد کے پہلو میں دیکھتا ہوں تو دل کو ناقابلِ بیان تکلیف محسوس
ہوتی ہے۔ جنون کا دورہ زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور میں
واپس بھاگ آتا ہوں۔

حیات! دعا کرو کہ خدا اس زندگی کا جلد خاتمہ کر دے۔ پہلے
اور اب کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گو پہلے بھی زندگی
میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں
دلچسپی ہے ہی نہیں۔ اور اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہے تو سہی لیکن
میری دسترس سے باہر ہے۔
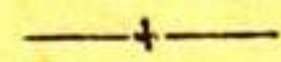
آٹھواں خط

آج کل غم بہت ہلکا ہے۔ کبھی کبھی کشمش کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آجاتی
ہیں اور میں غمگین ہو جاتا ہوں۔ مگر اختر اپنی مضحکہ خیز باتوں اور حرکتوں
سے پھر ہنسا دیتا ہے۔ وہ میرے دل سے کشمش کو بالکل محو کر دینا
چاہتا ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ شاید تم اختر کو

بھول گئے ہو یہ وہی اختر ہے جو دوسرے تیسرے ہمارے کمرے میں آجاتا تھا۔ اور گھنٹوں لایعنی باتوں سے میرا اور تمہارا دماغ کھایا کرتا تھا تم اکثر اس کی بک بک سے اکتا کر باہر چلے جاتے تھے۔ لیکن میں اس کا جی میلا نہ کرتا تھا۔ اور اس کے پاس بیٹھا دلچسپی سے باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ ولایت چلا گیا تھا۔ دو مہینے ہوئے انجنیری کی سند لے کر آیا ہے۔ اب یہ پہلا سا اختر نہیں رہا۔ بڑی عقلمندی کی باتیں کرتا ہے۔ بڑے بڑے چالاکوں کے کان کترتا ہے۔ ہفتہ سے میرے یہاں مقیم ہے اتفاقیہ سینما گھر میں مل گیا تھا۔ میں نے تو پہچانا بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کی اب کی اور پہلی شکل وصورت میں بہت فرق ہے اور لباس میں بھی۔ تماشہ ختم ہو جانے کے بعد میں اس کا سامان ہوٹل سے اپنے یہاں اٹھوا لایا تھا۔ ساری رات اُس نے ولایت کی باتیں کیں۔ صبح کو میں کچھ رنجیدہ سا تھا۔ اُس نے وجہ پوچھی اور میں نے بے کم وکاست سارا "افسانہ" سنا دیا۔ دیوار کو دیکھ کر کہنے لگا اسی میں کھڑکی دروازہ لگا دوں۔ میں نے کہا "نہیں اب کیا ضرورت ہے؟" کہنے لگا "اب کیا یہ خالی ہی پڑا رہے گا؟"

"تو کیا جو بھی اس مکان میں آکر آباد ہوگا۔ وہ مجھ سے محبت ضرور کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ضرور کرے گا۔ تم اسی قابل ہو کہ تم سے ہر ایک محبت کرے اگر تم ولایت جاتے تو دیکھ لیتے کہ تم پر کتنی پریاں عاشق ہوتیں۔ اور تمہیں یہ ساری پارسائی اور زہد طاق میں رکھنا پڑتا۔" وہ بہکتا رہا۔

اسی دن شام کو اس نے اپنے پاس سے ایک قسم کا تیزاب سا

پانی میں ملا کر پچکاری کے ذریعے دور کھڑے ہو کر ننھی سی دیوار پر چھڑک دیا۔ دس گیارہ بجے تک دیوار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں ہنسنے لگا "اختر تم مجھے بناتے ہو۔ بھلا دیوار پر اس پانی سے کیا اثر ہوتا۔

صبح کو دیکھنا" اُس نے یقین اور اطمینان کے ساتھ کہا۔

دوسرے روز علی الصبح میں شوق میں اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی باہر آیا تو دیوار غائب تھی۔ مجھے یقین نہ آیا۔ اسے میں نظر کا دھوکا سمجھا آنکھیں ملیں۔ پھر دیکھا دیوار ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ قصہ مختصر اختر نے اُس میں کمانیوں سے ایسا دروازہ لگایا ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا۔ بیچ دار ایک کھونٹی ہے۔ اس میں بٹن لگا ہے۔ بٹن کو دبانے سے دروازہ کھل جاتا ہے اور کمال یہ ہے۔ ذرا بھی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کمانیاں وہ اپنے ساتھ ولایت سے لایا تھا۔ کہتا ہے کہ یہ ایجاد ابھی ہندوستان نہیں پہنچی۔ اس سے ترکیب پوچھ لوں گا۔ تاکہ جب کبھی مکان چھوڑنا پڑے تو کمانیاں ساتھ لے جا سکوں۔

اختر آج کل میں جانے والا ہے۔ گو نہ میرا جی چاہتا ہے اور نہ اس کا کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن مجبوری ہے۔ ملازمت کا تار آگیا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔

نواں خط

تین چار ہفتوں سے پھر میں نے تمہیں خط نہیں لکھا۔ تمہارا خیال

غلط ہے میں ناراض نہیں۔ معافی کس بات کی مانگتے ہو۔ جو ہونا تھا ہو چکا مجھے اس بات کا ذرّہ برابر بھی خیال نہیں۔ میں تو تقریباً بھول چکا تھا۔ تمہیں نے یاد دلادی۔ خط نہ لکھنے کی وجہ وہی پہلی سی مصروفیت ہے اور کچھ نہیں۔ پندرہ بیس دن ہوئے یہ مکان آباد ہو گیا ہے۔ اور خدا نے کشمش کا ایسا نعم البدل عطا فرمایا ہے کہ الفاظ میں تعریف کرنا ناممکن ہے۔

ایک سارٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ شاید سارٹر کا مطلب تم اچھی طرح نہ سمجھ سکو۔ ڈاک خانے کی ایک شاخ "ریلوے میل سروس" ہے۔ سارٹر اس کے کلرک ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ اسٹیشنوں کے دفتروں میں کام کرتے ہیں اور باقی باہر جاتے ہیں۔ مختلف ڈاک گاڑیوں میں اور مختلف اطراف میں غریبوں کی کیا زندگی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ سارٹر صاحب بھی لاہور جاتے ہیں۔ تین دن یہاں رہتے ہیں۔ دو دن لاہور۔ تیس راتوں میں بارہ سفر میں کٹتی ہیں۔ بارہ دہلی میں اور چھ لاہور میں۔ بیچارے کو پیٹ کی خاطر کیسی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ ساری عمر کی کمائی ایک لڑکی ہے۔ جو دسویں جماعت میں تعلیم پاتی ہے اور بیوی دائم المرض ہے۔

جب یہ پہلے دن مکان میں آئے تو معمولی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ ذرا سی ملاقات بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔ کئی روز تک یہ نظر نہ آئے۔ میں نے بھی کچھ پروانہ کی۔ ایک دن تمہیں خط لکھنے بیٹھا تو حضرت آنازل ہوئے۔ دو تین سطریں ہی لکھنے پایا تھا کہ قلم اٹھا کر رکھ دیا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے اپنی مصیبتوں کا

ذکر شروع کر دیا کہ باوجود ہزاروں دواؤں کے استعمال کے ہنوز اولادِ نرینہ سے محروم ہیں۔ چار لڑکیاں ضائع ہو چکیں۔ پھر کہنے لگے۔ بیوی ہے وہ ہمیشہ کی بیمار۔ لڑکی اسکول میں پڑھتی ہے۔ ایک جان کیا کیا کام کرے گھر کے کام کاج کے لئے کوئی خادمہ مل جاتی تو اچھا تھا۔

"لڑکی کونسی جماعت میں ہے؟" میں نے اور باتوں کو قطع نظر کرتے ہوئے پوچھا۔

"دسویں میں"

"اتنی زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ پھر ایسے حالات میں اسے اسکول سے اٹھا لینا مناسب ہوتا۔"

"میری تو یہی مرضی تھی۔ مگر وہ کہنے لگی ابا ایک برس رہ گیا ہے کم از کم انٹرنس تو کر لوں۔"

مجھے وہ عہد یاد آ گیا۔ جو میں نے دو تین مہینے پہلے کشمش سے کیا تھا۔ اس لئے تعلیم دلانے کے خلاف اور کچھ نہ کہا۔

"خادمہ تو کوئی نظر میں ہے نہیں۔ البتہ ایک لڑکا ہے جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا ہے اور ہے بھی ہوشیار سمجھدار۔"

"کس عمر کا ہے؟"

"یہی کوئی بارہ تیرہ برس کا۔"

"کہاں ہے۔ پھر اسی (اسے ہی) بلا دو۔"

"بہت اچھا۔ اس مرتبہ جب آپ لاہور سے تشریف لائیں گے تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

وہ تو چلے گئے تو میں نے فوراً ارشید کو خط لکھ دیا۔ اس کے دو

تین خط آچکے تھے جن میں لکھا تھا کہ اب میں بالکل اچھا ہوں کسی جگہ کوئی نوکری ہو تو مہربانی کر کے بلا لیجئے۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیا ہے۔ ورنہ خط لکھوانے کے بجائے وہ خود کبھی کا آچکا ہوتا۔

رشید تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ خط ملتے ہی فوراً آگیا۔ پھر سارڑ صاحب نے ایک اور فرمائش کی کہ میں بازار میں کھانا نہ کھایا کروں۔ بلکہ دونوں وقت ان کے یہاں سے کھانا آجایا کرے گا۔ بہت سے عذر پیش کئے۔ مگر ان کے لئے ایک بھی قبول کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اتنے مصر کیوں ہیں۔ خیال کیا کہ شاید ان کی لڑکی نے کہا ہو۔ کیونکہ مجھے وہ تین چار دفعہ گلی میں مدرسے سے آتے جاتے مل چکی تھی اور شاید ایک دفعہ کھانا لاتے بھی دیکھ لیا تھا۔ لیکن پھر سوچنے لگا کہ اس نے تو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

مجھے اُن کی یہ فرمائش منظور کرتے ہی بن پڑی۔ رات بھر سوچتا رہا کہ ان کی لڑکی جوان ہے اور بیاہ دینے کے قابل۔ شاید ان حضرت کی نظرِ انتخاب مجھ غریب پر ہی پڑی ہے! انھیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی بظاہر تو کوئی خوبی ہے نہیں اور برائی بھی کیا ہے۔ خود بخود یہ خیال بھی عین اس وقت دماغ میں آگیا۔ جب کہ پہلی بات سوچ رہا تھا اور میں اپنے دل ہی دل میں شادی کے متعلق فیصلہ کرنے لگا کہ والدین کی رضامندی کے بغیر ہرگز ہرگز شادی نہ کروں گا۔ دسویں جماعت تک پڑھی لکھی لڑکی کو تو کبھی دولھن نہ بناؤں گا۔ اس کے علاوہ یہ بے پردہ بھی تو ہے۔ ایسے تو والدہ صحن میں قدم بھی نہ رکھنے دیں گی۔ پھر مجھے اس کے خوبصورت

خط وخال یاد آگئے اور اس کی مستانہ چال ـــــ اور میں نے محسوس کیا کہ اوپر کے فیصلے میں ضرور ترمیم ہونی چاہیئے۔

اس واقعے کے چوتھے دن یہ عقدہ کھلا۔ سارٹر صاحب فرمانے لگے کہ لڑکی کو یونیورسٹی کا امتحان دینا ہے پچھلے دنوں وہ دو مہینے بیمار بھی رہ چکی ہے۔ اور والدہ کی بیماری نے بھی اُسے اسکول کا کام نہیں کرنے دیا۔ کوئی بھلا مانس اور شریف استاد مل جاتا تو کمی پوری کرا دیتا۔ جی میں آتا ہے اشتہار دے دوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ اس طرح بھلے بُرے میں تمیز نہ ہو سکے گی۔"

میں کہنے ہی لگا تھا کہ "میں حاضر ہوں" لیکن یکایک بجلی کی تیزی کے ساتھ یہ خیال آیا "کیا میں بھلا مانس اور شریف بھی ہوں۔" اور لفظ زبان پر آتے آتے رہ گئے۔ آخر انھوں نے خود ہی کہا "اگر آپ یہ تکلیف کریں تو میں آپ کی ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں اور یہ احسان آپ کا ہم تینوں پر ہو گا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ کوئی خزانہ مل گیا ہے۔ میں نے کہا "نہیں صاحب احسان کس بات کا ہے میں تو آپ کا خادم ہوں جو حکم دیں بسر وچشم حاضر ہوں۔"

کوئی چار دن سے میں نے اسے پڑھانا شروع کیا ہے غضب کی ذہین لڑکی ہے۔ جو بتاتا ہوں فوراً یاد کر لیتی ہے۔ اس کے باپ کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ تو بغیر میری مدد کے بھی بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی۔

کل سے ہم کھانا بھی ایک ساتھ کھا رہے ہیں۔ اس کا علم صرف رشید کو ہے۔ سارٹر صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں ماں غریب منہ سر پیٹے پڑی رہتی ہے۔ وہ اس تعلیم اور بے پردگی کے بہت خلاف ہے

مگر شوہر دم مارنے نہیں دیتا۔ ابھی میں نے چوردروازے سے کار راز اسے نہیں بتایا۔ چار پانچ دن میں امتحان کی تیاری کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ میں بھی ڈاکٹری سرٹیفکٹ بھیج کر چھٹی لے لوں گا۔

حیات! اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ حسین بھی ہے تعلیم یافتہ بھی ہے۔ ہارمونیم اور پیانو پر اردو انگریزی کے گیت گا لیتی ہے۔ لیکن دل اس سے شادی کرنے کو نہیں مانتا۔ گو روز بروز مجھے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت ہوتی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی یقین ہے کہ شادی کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گا۔ خواہ اس کا انجام کیسا ہی خوفناک کیوں نہ ہو۔
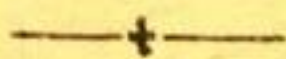
دسواں خط

دو دن سے چھٹی لے رکھی۔ بڑے لطف سے گزر رہی ہے۔ اس کی بھی چھٹیاں ہیں۔ ہم ایک ساتھ سیر کو جاتے ہیں۔ وہ بھی مردانہ لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ ان کے اسکول میں ایک تمثیل کی گئی تھی۔ جس میں شہزادے کا پارٹ اس نے کیا تھا۔ اس کی دو پوشاکیں اس کے پاس موجود ہیں۔ مردانہ بھیس میں ایسی دل کش معلوم ہوتی ہے کہ کیا کہوں میں بھی برجس پہن کر اور دوپٹہ باندھ کر سیر کو جاتا ہوں۔ لوگ اسے دیکھ کر بیخود ہو جاتے ہیں۔ بہت سے کمینے کبھی کبھی کچھ بک دیتے ہیں تو اسے بہت ناگوار گزرتا ہے۔ ایک اور مزے کی بات سنو۔ جب یہ بات کرتی تھی تو

اُسے یاد نہ رہتا تھا کہ میں مرد بنی ہوئی ہوں۔ صیغہ مذکر استعمال کرنا چاہیئے وہی مؤنث صیغہ "میں گئی"، "میں بولی"۔ زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے اس سے کہا کہ انگریزی میں بات چیت کیا کرو۔

پرسوں پہلی مرتبہ میں نے چور دروازے کو استعمال کیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسے مکان میں بیسویں صدی کی یہ ایجاد ہونا حیرت انگیز ہے۔ کل وہ اپنی ایک سہیلی کو جو حسن و صورت کے اعتبار سے اس سے ذرا کم نہیں دروازہ دکھانے لائی تھی۔ میرا بھی استاد کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔ سہیلی تعریف کرتے کرتے مذاق پر اتر آئی "لیکن دروازے کی یہاں کیا ضرورت ہے"۔ شاگرد سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔ آخر استاد کو بولنا پڑا۔ "یہ کمانیاں فالتو رکھی تھیں اس دیوار میں لگا دیں کہ چلو نمائش رہے گی۔ یار دوستوں کو دکھا کر تعریف ہی سنا کریں گے"۔

حیات اِلّم اس کا نام کیوں پوچھتے ہو؟ کیا اسے بھی خط لکھنے کا ارادہ ہے۔ دوست! اب ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے اس کا نام گلاب تجویز کیا ہے۔ کیونکہ اس کے رخسار گلاب کی طرح کھلے رہتے ہیں اور نزاکت میں بھی کسی طرح گلاب سے کم نہیں۔ یہ تو ہر حیثیت سے کشمش سے بازی لے گئی۔ تمہارے کاہل دوست کو اس نے اپنا رازداں بنا لیا ہے اور طالب علمی کے وہ وہ تجربے بیان کئے ہیں کہ اگر میں انھیں کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرا دوں تو نوے فی صدی آدمی تعلیم نسواں کے خلاف ہو جائیں۔ کم از کم موجودہ طرز تعلیم کو تو کوئی بھی پسند نہ کرے۔ میرے دل میں اس کی قدر بھی

اور نہیں بھی۔ جب اس کی خوبیوں پر نظر جاتی ہے تو یہ حور سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے اور جب عیبوں کو دیکھتا ہوں تو ——

آج کی بات ہے گلاب کہنے لگی

"ایک بات پوچھوں اگر آپ سچ سچ بتائیں"۔

"پوچھو" میں نے کہا۔ لیکن وہ چپ رہی "پوچھو" میں نے پر اشتیاق لہجے میں کہا "چپ کیوں ہوگئیں"۔

"آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

اب خاموش ہونے کا میرا نمبر تھا۔ وہ ایک منٹ جواب کا انتظار کر کے بولی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے"۔

میں جھوٹ بولنا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے کہا۔

"اس کا جواب کل دوں گا"۔

"جو بات ہے آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ آپ کو سچ بولنے میں تامل ہے"۔

ٹھیک اس وقت گلاب کے والد آگئے اور میں اسے سبق پڑھانے میں مصروف ہوگیا۔

حیات! اگر تم تیار ہو تو میں اسے اور اس کے باپ کو تو راضی کر لوں گا۔ یہ یاد رہے کہ کسی سے پردہ نہیں کرتی اور دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔

———+———

گیارھواں خط

گلاب چھ روز سے بیمار ہے۔ سردی لگی تھی اس سے بُخار ہوگیا تھا اس نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پھر نمونیہ ہوگیا۔ اس کے والد کی ڈیوٹی بتدیل ہوگئی ہے۔ پرسوں راولپنڈی گئے ہیں۔ تین دن میں واپس آئیں گے جب وہ جانے لگے تو گلاب کو معمولی سی حرارت تھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ معمولی سی حرارت خطرناک بُخار اور نمونیہ کی صورت اختیار کرے گی جس رات کو وہ گئے اسی رات کو گلاب کو بہت زور کا بُخار چڑھ آیا۔ اور سینے میں درد ہونے لگا۔ میں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ کہ اس کی ماں نے دیوار میں اینٹیں مار مار کر جگا دیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور ان سے پوچھنے پر گلاب کی حالت معلوم ہوئی۔ گھبراہٹ ہی میں میں نے خفیہ دروازہ کھول لیا۔ مجھے اس بات کا قطعی خیال نہ آیا کہ گلاب کی والدہ کو ابھی تک اس دروازے کا حال معلوم نہیں۔ اور جلدی میں اسے کھلا ہی چھوڑ گیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا "کہاں سے آگئے۔ دیوار پر سے؟"

"ہاں۔"

"کودنے کی آواز تو آئی نہیں"۔ وہ بولیں۔

اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں چپ رہ گیا۔ مگر انھوں نے زیادہ خیال نہ کیا۔ کیونکہ لڑکی کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھیں۔ میں نے نبض دیکھی۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ "بے وقت اور پھر کسی ڈاکٹر کا گھر معلوم نہیں ہسپتال بہت دور ہے۔" میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے دروازے کا بٹن دبا دیا۔

کپڑے پہنتے ہوئے یہی فکر رہا کہ کو نسے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں۔ آخر زینہ میں ہو کر ان کے یہاں گیا۔ اُس کی والدہ نے کُنڈی کھولی اور میں انہیں تسلّی دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹروں کی دو تین دکانوں پر آوازیں دیں۔ مگر بے سود۔ میں نامراد واپس آنے ہی لگا تھا کہ ایک سپاہی نے ڈاکٹر کا گھر بتایا۔ اس کے یہاں گیا۔ بڑی دیر میں تیار ہو کر آیا اور کہنے لگا۔ "آٹھ روپے فیس ہوگی۔"

"آپ چلئے تو سہی فیس بھی لے لیجیے گا۔"

مَیں اسے لے کر گھر آیا۔"

گلاب کا بُخار اب اور بھی زیادہ ترقی کر گیا تھا اور اس پر مکمل بیہوشی طاری تھی۔ انھوں نے مقیاس الحرارت سے بُخار کا درجہ معلوم کیا اور کہا "بہت خطرناک حالت ہے۔ اگر آج رات آرام سے گزر گئی تو خیر۔ ورنہ ——"

"ورنہ کیا" میں نے جلدی سے دریافت کیا۔

"ورنہ زندگی کا خطرہ ہے۔"

"زندگی کا خطرہ ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار یہ لفظ نکل گئے میں اس کے ساتھ ہی گیا اور دوا لے آیا۔ فیس میں نے اپنے پاس سے دیدی اور گلاب کی والدہ سے کہہ دیا یہ میرا دوست ہے۔ فیس ویس کچھ نہ لے گا۔ دوا کی قیمت اس نے کچھ نہ لی تھی۔ ایک ایک گھنٹے کے بعد خوراکیں دینی تھیں میں اس کے پلنگ کے نزدیک کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگا لیے اور اس کی والدہ سے کہا۔ "آپ اس کے سینے میں دوا کی مالش کر کے آرام کریں۔ میں جاگتا رہوں گا۔ فکر کی

بات نہیں۔" وہ غریب چاہتی تو یہ تھی کہ بیٹی کے پاس بیٹھی رہے۔ مگر کھانسی کا دورہ اٹھنے لگا۔ اور مجبور ہو کر لیٹ گئی۔ میں نے اسے جب دوا کی دوسری خوراک دی تو اُس نے آنکھیں کھولیں ـــــ میں نے کہا "کیسی طبیعت ہے گلاب" وہ مجھے تکتی رہی۔ مایوسی اور حسرت کے ساتھ اور پھر اس نے کروٹ لے لی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ حیات میں سمجھتا تھا کہ میں گلاب سے یونہی دل بہلا لیتا ہوں۔ مجھے اس سے محبت نہیں ہے مگر کل رات پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل میں اس کی محبت موجود ہے ـــــ بے انتہا محبت۔ اس کی بیماری سے میرا دل بہت بے چین تھا۔ سارے کمرے میں سکوت نے تسلط کر رکھا تھا۔ ایک ٹائم پیس کے چلنے کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ یا کبھی کبھی مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی کو دیکھا اور سہم گیا۔ کچھ دیر پہلے کوئلے سرد تھے پھر سلگنے لگے۔ آخر سارے دہک گئے اب کچھ دیر میں خاک ہو جائیں گے۔ یہی حالت دنیا کی ہے۔ دُنیا ایک انگیٹھی کے مانند ہے اور ہم سب انسان کوئلے ہیں۔ جلتے ہیں اور جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ دنیا ویسی کی ویسی رہتی ہے جب میرا دل زیادہ گھبرایا تو میں صحن میں نکل کر ٹہلنے لگا۔ چاند نکل چکا تھا۔ ہر چیز چاندنی کے سمندر میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بڑا دلفریب منظر تھا۔ ہر طرف سکوت، ہر طرف چاندنی ـــــ مگر مجھے یہ سکوت اور یہ چاندنی ایک ڈائن معلوم ہوئی جو میری گلاب کو کھانے آئی تھی۔ میں پھر کمرے میں آ کر گلاب کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اور اس کے مرجھائے ہوئے زرد گالوں کو دیکھنے لگا۔ گیسو پریشان ہو کر رخسار دوں پر آ گئے تھے۔ تین منٹ مسلسل

نہ دیکھ سکا۔ میرا جی بھر آیا۔ اُس نے پھر کروٹ بدلی۔ میں نے کہا "گلاب! گلاب!" وہ بے ہوش تھی اس لئے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے اُس کی پیشانی پر اپنا رُخسار رکھ دیا ـــــ میں بے بس تھا۔ ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں رو رہا تھا۔ آہ ـــــ اس کی پیشانی دہکتے ہوئے کوئلوں سے زیادہ گرم تھی اور سُرخ۔ شاید میرے آنسوؤں کی نمی کا احساس اسے ہوش میں لے آیا۔ اُس نے بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں کھولیں اور نازک نازک لبوں کو حرکت دی۔ "ظفر صاحب! ابا جی کو تار دے دیا؟" میں نے کہا نہیں۔ مگر اُس نے میرا جواب نہیں سُنا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

غرض کہ میں ساری رات اس کے قریب بیٹھا روتا رہا۔ علی الصبح پھر ڈاکٹر کے پاس گیا اور حالت بیان کی۔ وہ کمبخت کہنے لگا کہ آثار اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ "گویا مطلب ـــــ" میں بہ مشکل یہ الفاظ ادا کر سکا۔ "مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے یہ سوچا کہ یہ ڈاکٹر کام کا نہیں۔ اسے تو تیمارداروں کی تسلّی بھی کرنی نہیں آتی حالانکہ اس نے صاف صاف بات کہہ دی تھی دوسرے ڈاکٹر کو لا کر دکھایا۔ اس کی دوا سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

آج تمام دن انتہائی پریشانی میں بسر ہوا۔ یہ خط بھی اس کے قریب بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دوسرے ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا ہے آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہیں۔ اب ان میں آنسو نہیں رہے۔ جی گھبرا رہا تھا تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خبر نہیں جلدی اور رنج میں کیا کیا

لکھا گیا۔ حیات دعا کرو کہ خدا گلاب کو صحت عطا کر دے۔ لیکن وہ تو آپ کی دعا سے پہلے ہی اس قسم کی دعاؤں سے بے نیاز ہو چکے گی۔ آہ خدا نہ کرے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں کیونکر زندہ رہوں گا ــــــ حیات! گلاب کے بغیر میں زندگی کا "بارگراں" نہ اٹھا سکوں گا۔
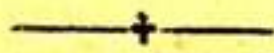
بارھواں خط

اس مرتبہ تم نے خط کا جواب خلافِ معمول بہت جلد دے دیا۔ لیکن میں حسبِ معمول تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ تمہاری دعاؤں کا شکریہ نہ زبان سے ادا ہو سکتا ہے نہ قلم سے۔ تمہاری دعاؤں ہی کی بدولت گلاب کی جان بچ گئی۔ ورنہ بیماری کا حملہ بہت مایوس کن تھا۔ اور ہم سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔

کئی روز سے خط لکھنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لیکن بے وجہ دیر ہوتی رہی اور اب تین چار دن سے ایک "الجھن" نے پریشان کر رکھا ہے ہزار سوچتا ہوں، دماغ پر لاکھ زور دیتا ہوں۔ مگر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا بالکل مجبور ہوں اور بے بس۔ آپ سے "رازِ دل" بیان کرتا ہوں۔ شاید آپ اس معاملے میں میری کچھ مدد کر سکیں۔

پرسوں جب میں دفتر سے آیا تو رشید نے مجھے ایک لفافہ دیا۔ جس پر گلاب کے والد کا پتہ تحریر تھا اور بولا "یہ بی بی جی دے گئی ہیں"۔

"وہ خود کہاں ہیں" میں نے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔

"خبر نہیں صاب" رشید کہہ کر چلا گیا۔
میں نے لفافہ میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ گلاب کے کسی رشتہ دار حضرت کا خط تھا۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا "دو خط لکھ چکے آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اگر آپ نے اس خط کا جواب بھی ایک ہفتے کے اندر اندر نہ لکھا تو ہم آئندہ رضوان کے رشتے کے لئے آپ کو کبھی نہ لکھیں گے۔ خدا نہ خواستہ رضوان میں کوئی عیب نہیں ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ نیک چلن ہے۔ آج ہم ذرا تحریک کریں تو بیس رشتے موجود ہو جائیں۔ مگر اس کی اور اس کی والدہ کی یہی مرضی ہے کہ آپ ہی کے یہاں ہو۔ اس لئے بھائی مکرر عرض کرتا ہوں کہ رضوان کو اپنی غلامی میں قبول کر لیجئے اور اگر آپ کا ارادہ کچھ اور ہو تو جلد مطلع فرمائیے۔
میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ کیا والد صاحب کو خط لکھ دوں کہ میرے رشتے کے لئے گلاب کے والد کو لکھیں۔ پھر مجھے والدہ کا خیال آ گیا —— میں ابھی اسی قسم کے خیالات میں محو تھا کہ گلاب اپنے مکان میں آئی اور رشید سے میرے متعلق دریافت کر کے فوراً میرے پاس آ گئی اور آتے ہی ریاضی کا ایک سوال سمجھانے کے لئے کہا۔ میں اس وقت اپنا ایک نہایت "اہم سوال" حل کر رہا تھا۔ لیکن گلاب کی بات کو رد کرنا بھی آسان نہ تھا لہٰذا حساب کی کتاب لے کر سوال کی عبارت پڑھنے لگا۔ ابھی میں نے سوال کو دوسری دفعہ ہی پڑھا تھا کہ ایک نسائی آواز نے ہم دونوں کو حیران کر دیا۔
"کیا ظفر صاحب اسی مکان میں رہتے ہیں؟"

میں اور گلاب ایک ساتھ اٹھ کر زینے کے دروازے تک گئے ایک سرو قد عورت کشمشی رنگ کا برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ کشمش ہے۔ آواز سن کر پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا قد اور برقعہ دیکھا تو بالکل یقین آ گیا۔ گلاب کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہنے لگی "تم کون ہو ــــــ اوپر آ جاؤ۔"

"ایک بد نصیب بیوہ" اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بیوہ! خدا نہ کرے۔" میں نے کہا خدا تمہارے سہاگ کو قائم رکھے۔

جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو گلاب تعجب سے میری طرف تک رہی تھی۔

کشمش اوپر آ گئی اور ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے گلاب کے کہنے سے برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ لیکن دونوں کو یہ خیال رہا کہ میں نے انھیں ایک دوسری کے متعلق صاف صاف بات نہیں بتائی۔ گلاب تو ہر روز کے معمولی لباس میں تھی۔ مگر کشمش بہت بن سنور کر آئی تھی۔ اس کا لباس اور چہرے کی خوشی کی علامتیں دیکھ کر اور اس کی گفتگو سن کر کوئی اسے بیوہ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس مکان سے جانے کے پندرہ دن بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دُکان کا حصہ دوسرے حصہ دار کے پاس فروخت کر دیا اور سارا روپیہ بنک میں جمع کرا دیا۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں دوسرا نکاح کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ

اس کے لئے شوہر میں تجویز کروں اور اگر میں نے ایک ہفتے میں کوئی امید افزا جواب نہ دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے دہلی سے چلی جائے گی اور یہ کہ اس وقت اس کے پاس جائداد اور نقد تیس ہزار کے قریب ہے۔

کشمش جب تک بیٹھی رہی مجھے حسرت اور امید سے تکتی رہی اور گلاب کشمش کو۔ کچھ دیر کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اور ہم مختلف قسم کے خیالات میں کھو گئے۔ آخر کشمش اٹھی اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے کہا "ذرا دیر ٹھیریئے کھانا تیار ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کھانا تیار ہے؟ کہاں؟ مجھے تو نظر آتا نہیں۔"

"ابھی نظر آنے لگے گا۔ دو لمحے انتظار تو کیجئے"۔ میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور گلاب کی طرف دیکھا۔

گلاب چپ چاپ بیٹھی تھی۔ حیات! وہ گلاب جو انتہا سے زیادہ خلیق ہے اور مہمان نواز۔ اس وقت کسی خیال میں محو تھی۔ نہ اُسے اخلاق کا دھیان تھا نہ خاطر تواضع کا۔ میں اُس سے کھانا لانے کے لئے لفظی درخواست کرنے ہی لگا تھا کہ کشمش یہ کہہ کر چلی گئی "آپ تکلیف نہ کیجئے میں اس وقت نہیں ٹھیر سکتی"۔

اس کے جاتے ہی گلاب بھی اٹھ کر چلی گئی اور میں بغیر کھانا کھائے روشن آرا باغ کی طرف چلدیا۔ راستے میں طبیعت کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئی اور میں نے جنگل کا رُخ کیا۔ آبادی سے بہت دور جا کر جمنا کے کنارے ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ سینے میں خیالات کا

ایک سمندر موجزن تھا۔ اور دل سے ایک ابال سا اٹھ رہا تھا سامنے دریا کا پانی خراماں خراماں بہہ رہا تھا۔ چاند نہ نکلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خود بخود کیا ہو گیا۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ کشمش کی ملاقات کا رنج تو ہوا نہیں۔ خوشی کی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر دل کو کیا ہو گیا۔ دماغ کیوں پریشان ہے۔ پھر چاند نکلنے لگا۔ اس کا عکس پانی میں ایسا دلفریب تھا کہ میرا دل ذرا دیر کے لئے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اور یکایک خیال آیا کہ مجھے گلاب اور کشمش میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہے میں نے محسوس کیا کہ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں۔ جہاں سے "منزل" کو دو راستے جاتے ہیں اور ہر راستے میں الگ الگ "رفیقِ سفر" ملے گا۔ ایک راستہ اختیار کرنے سے اپنی حالت بدل جائے گی۔ عیش و عشرت اور امیرانہ ٹھاٹھ سے مسافت طے ہو گی۔ روپے پیسے کے تفکرات سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔ گو رفیق سفر کچھ عمر رسیدہ سا ہے۔ لیکن تجربہ کار اور ہوشیار ہے۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے سے تمام سفر میں روپیہ حاصل کرنے کے فکر اور پیٹ بھرنے کے افکار چین نہ لینے دیں گے۔ لیکن ساتھی ایسا ہو گا جسے دیکھ کر ہی تمام رنج و غم کافور ہو جائیں جو جوانی میں مست اور حسن میں مخمور ہے۔ جس کے مقابلے میں انسان دنیا کی ہر نعمت کو بخوشی ٹھکرانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا رہا۔ پانی کی سطح پر نظریں جمائے سوچتا رہا۔ لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کونسا راستہ بہتر ہے۔

چاند کافی بلند ہو چکا تھا۔ ہر چہار سمت چاندنی نے اپنی دلفریب چادر بچھا کر ایسا دلچسپ اور سہانا منظر پیدا کر دیا تھا کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ "کاش یہاں گلاب ہوتی" اور دوسرے لمحہ یہ

الفاظ میری زبان سے نکل رہے تھے "یا کشمش"۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی فیصلہ کر کے وہاں سے آؤں۔ لیکن دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا۔ چاند کو دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ کشمش اس چاند کے مانند ہے۔ اور گلاب ہلال کے مانند۔ گلاب ایک کلی ہے خوشنما۔ جو عنقریب کھلنے والی ہے۔ اور کشمش ایک شگفتہ پھول ہے اسی طرح مقابلہ کرتے کرتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گلاب کو حسن و صورت کے لحاظ سے کشمش پر فضیلت حاصل ہے اور کشمش دولت اور محبت کے اعتبار سے گلاب سے افضل ہے۔ جب میں قطعی مجبور ہو گیا اور ایک رائے قائم نہ کر سکا تو میں نے وہ کیا جو شاید ہر انسان ایسے موقع پر کیا کرتا ہے۔ یعنی تقدیر پر چھوڑ دیا —— اور وہاں سے چلا آیا۔ واپس آتے ہوئے میرے دل میں کشمش کی زیادہ عظمت تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کشمش مجھے گلاب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ لیکن گھر پہنچنے پر اس بات کی بالکل تردید ہو گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے زینہ میں نہایت آہستہ آہستہ قدم رکھ کر اوپر چڑھا۔ زینے کے دروازے میں پہنچ کر میں دو ایک لمحے ٹھیرا اور پھر تیزی سے یک لخت کمرے میں چلا گیا میز پر میرا فوٹو رکھا تھا اور گلاب اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ اور رحم طلب نگاہوں سے تکنے لگی۔ حیات! خبر نہیں ان نظروں میں کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج تمام کائنات غمگین ہے۔ اور میری بیوفائی کا ماتم کر رہی ہے۔ میں نے کپڑے بدلے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ گلاب آکر قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں —— مجھے بھوک نہیں۔"

"کیوں کیا کہیں اور کھا آئے۔"

"نہیں"۔

گلاب نے رشید کو آواز دی اور کہہ دیا کہ برتنوں کو اٹھا کر رکھ دے اُس نے دریافت کیا۔ کھانا نہیں کھائیں گے۔ کہنے لگی "نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔"

"اور آپ" رشید نے دوبارہ پوچھا۔

"مجھے بھی بھوک نہیں" گلاب نے جواب دیا۔

"آپ جب تو کہہ رہی تھیں بھوک لگ رہی ہے۔ خبر نہیں ظفر صاحب ــــــ"

"تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔ اپنی طرف سے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" گلاب نے ناراضی سے رشید کی بات کاٹ کر کہا۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ نہ جانے گلاب کیا سوچ رہی تھی۔ لیکن میں اسی سوال میں الجھا ہوا تھا کہ کسے انتخاب کروں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گلاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کا چہرہ کسی خاص غم سے پژمردہ ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں نم آلود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پھر چپ ہو جاتی ہے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔

"گلاب!"

اس نے اپنی نظریں زمین پر سے اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں جن کی سیاہی میں دو سفید سفید موتی چمک رہے تھے۔ اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ میں نے پھر کہا

"گلاب!"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ میرا بھی جی بھر آیا۔ لیکن میں نے ضبط کیا اور اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں کسی کے اوپر چڑھنے کی آواز آئی۔ گلاب کے والد ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ اور کسی اور کے آنے کا وقت نہ تھا۔ حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آ گیا اور صحن میں نکل آیا۔ دیکھا کشمش ہے۔ مجھے اس کی آمد سے اس وقت رنج ہوا۔ گلاب کسی نامعلوم غم میں رو رہی تھی میں چاہتا تھا کہ اس سے اُس کے رنج کی وجہ دریافت کروں اور یہ بات صرف تنہائی میں پوچھی جا سکتی تھی۔ کشمش مجھے دیکھتے ہی بولی۔

ظفر! پیارے ظفر۔" اُس کا خیال تھا کہ میں کمرے میں اکیلا ہی ہوں۔ میری شہادت کی انگلی خود بخود اٹھ کر میرے منہ کے قریب چلی گئی اور کشمش محجوب سی ہو گئی۔

گلاب کشمش کے آنے سے خاموش تو ہو گئی۔ لیکن اس کے چہرے کے نقوش سے صاف ظاہر تھا کہ یہ پہلے سے دو چند غمگین ہے اور کشمش دوبارہ آنے پر پریشان تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انھیں تفصیل کے ساتھ سارے واقعات بتا دوں اور پھر دونوں سے رائے لوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نہایت مشکل سے میں نے پہلے کشمش کے حالات بیان کیے پھر گلاب کے۔ دونوں نے غور و خوض سے میری باتیں سنیں۔ مگر دونوں غمگین تھیں اور اُداس۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ اس لیے میں اور گلاب کشمش کو پہنچانے گئے۔ وہاں سے آ کر گلاب بھی اپنے یہاں چلی گئی اور میں تمام رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی کشمش آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی

کبھی گلاب اور کبھی دونوں۔

حیات! تم میرے دوست ہو اور تمہیں ساری باتیں بھی معلوم ہیں۔ شاید تم مجھ سے بہتر رائے قائم کر سکو۔ بتاؤ ــــــ پہلے خوب سوچو اور غور کرو، پھر بتاؤ کہ کون بہتر ہے۔

ــــ٭ــــ

تیرھواں خط

تم بھی ایک فیصلہ نہ کر سکے۔ مجھے یہی توقع تھی۔ میری رائے معلوم کرنے کا تمہیں بہت اشتیاق ہے۔ سنو پہلے میں نے بڑی کوشش کی کہ صرف ایک کو انتخاب کر لوں۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ دل قابو سے باہر تھا۔ اگر عقل کشمش کے حق میں رائے دیتی تھی تو یہ گلاب کے لئے تڑپتا تھا اور جب میں گلاب کو انتخاب کرنے لگتا تو کشمش کی خاطر مچلتا غرض کہ دل نے دو دن اور تین رات پریشان رکھا۔ آخر میں نے تیسرے دن کشمش سے پوچھا اس نے کہا "گلاب سے شادی کر لیجئے۔ میرا کیا ہے میں تو آپ کی اور آپ کی وجہ سے گلاب کی خادمہ ہوں۔ عمر بھر دونوں کی خدمت کرتی رہوں گی۔ پھر میں نے گلاب سے دریافت کیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ کشمش مجھ سے بہتر ہے اور میں تو آپ دونوں کی لونڈی بننا اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ لیکن ان دونوں کے جواب میں ایک نمایاں فرق تھا۔ کشمش کے لب و لہجے میں صدق تھا اور اخلاص اور گلاب کے لب و لہجہ میں شکایت تھی اور طنز۔ جب میں نے دیکھا کہ میں دونوں میں سے

کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تو مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو حبالۂ عقد میں لے لیا جائے۔ لیکن اس کی دونوں نے تردید کی اور یہ رائے دی کہ قرعہ ڈالا جائے۔ لہذا میں نے شام کو انھیں اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔ اور چائے پینے کے بعد میں نے کاغذ کے دو پرزوں پر کشمش اور گلاب لکھا۔ پھر دونوں پرزوں کی گولیاں بنا کر رشید سے کہا کان میں سے ایک اٹھا لو۔ اس نے ایک گولی اٹھا لی۔ ہم تینوں۔ بے تاب ہو گئے کہ جلدی کھول کر پڑھیں۔ گلاب نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا اور اپنا نام دیکھ کر شرما گئی۔ لیکن اس کی صورت پر خوشی کی ایک رو دوڑتی صاف نظر آ رہی تھی۔ کشمش نے کاغذ کی دوسری گولی اٹھا کر کھولی۔ پھر ہنستے ہوئے گلاب کو بہترین خاوند ملنے پر مبارکباد دی اور دو ہزار نقد دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے پہلے تو خوشی ہوئی پھر رنج اور کشمش بہ ظاہر مسرور تھی اور بہ باطن رنجیدہ۔

گلاب کے والد سے یہ قرار پایا ہے کہ فی الحال صرف نکاح کر لیا جائے اور پھر دو ایک مہینے میں وہ اپنے وطن جا کر باقاعدہ وداع کر دیں گے

حیات! یہ بات ہے بھی درست۔ نکاح ہونے کے بعد تو کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔ ورنہ والدہ اس شادی کی ہرگز اجازت نہ دیں گی۔

پرسوں بعد مغرب نکاح ہے۔ اگر تم شامل ہونا چاہو تو آ جاؤ۔ اور کسی شخص کو اس کی خبر نہ ہو۔

آخری خط

آپ کا پارسل ملا۔ "سنہری انگوٹھیوں" اور "سہرے" کا شکریہ قبول فرمائیے۔ انگشتری پر میرا اور اپنا نام دیکھ کر گلاب کو بڑی خوشی ہوئی۔ گو آپ کے تحفے دیر سے پہنچے لیکن اس میں آپ کی غلطی نہیں۔ میں نے اطلاع ہی بہت دیر سے دی تھی۔ اور اس سے زیادہ جلدی آپ کیا کرتے۔ گلاب اپنے شوہر کے عزیز از جان دوست کو سلام کہتی ہے اور ملاقات کا شوق ظاہر کرتی ہے۔ حیات آپ نے دو انگوٹھیاں کیوں بھیجیں۔ بس ایک ہی کافی تھی۔ فضول خرچی بہت بری ہے جس انگوٹھی پر ہمارے نام کندہ ہیں۔ ہم وہ رکھ لیں گے اور دوسری واپس کر دیں گے۔ مگر ایک شرط ہے ——

حیات! اگر تم برا نہ مانو تو تمہیں ایک بہت اہم راز سے آگاہ کر دوں ایسے راز سے جس کے انکشاف کے بعد تم بہت جز بز ہو گے لیکن شکست ہو چکی ہے۔ اب شرمندگی سے کچھ حاصل نہیں اور نہ کسی قسم کی تاویل سے تمہیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا اور بغیر کسی دلیل کے تمہاری تحریریں —— طویل خطوط میرے پاس محفوظ ہیں جو تمہارے انکار کرنے پر ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ ابھی اور اس راز کو ظاہر نہ کرتا۔ لیکن صبح جو میں نے پ[illegible]ی ڈائری دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو پورا ایک برس ہو چکا ہے جس نے مجھے یہ افسانہ لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ آج ہی حامد کا خط بھی آیا ہے اور قیوم کا بھی۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ اب بغیر کسی توقف کے آپ کو یہ راز بتا دیا جائے۔

راز یہ ہے کہ میں نے تمہیں کامل چھ مہینے بے وقوف بنائے رکھا۔

اور تم بھی یہ تسلیم کر و گے کہ اس دراز عرصے میں ایک دن بھی تمہیں اپنی بیوقوفی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وقت یاد کرو جب تم نے یہ شیخی ماری تھی کہ تم میرے لکھے ہوئے فسانے پر کبھی یقین نہ کرو گے اور کبھی یہ نہ مانو گے کہ وہ فسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ خطوط کیا ہیں —— میرا لکھا ہوا فسانہ۔ اب سیدھے ہاتھ سے بیس روپے عبداللہ کو دے دو۔ تم شرط ہار چکے ہو۔ اور اگر ابھی تمہیں یہ یقین ہو کہ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں وہ درست ہے۔ حقیقت ہے تو پہلی گاڑی سے دہلی چلے آؤ۔ اور یہاں آ کر مکان کا حدود اربعہ دیکھ لو اور چور دروازہ بھی۔ اختر تو ابھی ولایت ہی سے نہیں آیا۔ اور محلّہ میں جس شخص سے چاہو دریافت کر لو کہ میں چھ مہینے سے نیچے کے مکان میں رہتا ہوں جس کے برابر کا مکان بہت دنوں سے خالی پڑا ہے اور اوپر کا بھی۔ دوسری طرف میدان ہے۔ سامنے سڑک ہے۔ حیات جب یہ شرط قرار پائی تھی میں نے اس دن تہیّہ کر لیا تھا کہ ایسے وقت میں شکست دوں کا جب تم قطعی بھول چکے ہو گے۔ اس لئے چھ ماہ بعد یہ ذکر چھیڑا اور نصف برس تک تمہیں اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں نے جتنے بھی خط تمہیں لکھے۔ ان کی نقلیں برابر عبداللہ، قیوم، شفقت اور حامد کے پاس بھیجتا رہا۔ کیونکہ یہی اصحاب اربعہ شرط کے گواہ ہیں۔ اب تم سمجھے کہ میں منیل سے کیوں خط لکھا کرتا تھا۔

تم کہو گے کہ اس بات کو اتنا طول دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دو ایک خطوں کے بعد ہی یہ مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ درست ہے۔ لیکن اس طرح افسانہ مکمل نہ ہوتا۔ ہاں البتہ کشمش کی جدائی کے ذکر کے بعد میرا ارادہ تھا کہ ظاہر کر دوں۔ مگر حامد نہ مانا اس نے کہا کہ ابھی دو ایک مہینے اور یہ دلچسپ کھیل کھیلتے رہیئے۔ اس کے بعد میں فلاں تاریخ کو شاہ آباد جاؤں تو ظاہر

کرنا۔ تاکہ میں اُن سے مٹھائی کے روپے وصول کر سکوں۔" شاید وہ آج شاہ آباد پہنچ گیا ہو۔ تم اُسے یہ خط کیوں دکھانے لگے۔ لیکن واضح ہو کہ میں اس کی نقل بھی اس کے پاس علیحدہ ارسال کر رہا ہوں۔

تمہیں تعجب ہو گا کہ تمہارا وہ خط جو تم نے کشمش کو لکھا تھا۔ مجھے ہی ملا تھا۔ ڈاکیہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے اوپر والے کمرے میں کوئی بزاز کی بیوی رہتی ہے۔ میں نے کہا کیوں کیا بات ہے اس نے مجھے لفافہ دکھایا۔ میں نے تمہارا خط پہچان لیا اور اس سے لے کر رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس وقت وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ جب آئیں گے میں پہنچا دوں گا۔ جن جذبات کا تم نے اُس خط میں اظہار کیا۔ وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔ اگر سچ مچ کوئی کشمش ہوتی اور تمہارا خط اسے مل جاتا۔ تو تمہیں اور تمہارے دوست کو جی بھر کے کوستی اور گالیاں دیتی۔

حیات! معاف کرنا۔ لیکن اس میں میری کیا خطا۔ بیس روپے کی شرط ہوئی اور تم اس کے ذمہ دار ہو۔ تمہاری انگوٹھیاں اس شرط پر واپس کی جا سکتی ہیں کہ تم "شرط" کے روپے خوشی سے دے دو۔ اور اگر ذرا بھی حیل و حجت کی تو انگوٹھی سے روپے وصول کر لیے جائیں گے۔

بیمارِ عشق

میں سمجھتی تھی کہ دُنیا میں مجھ سا بدنصیب کوئی نہیں اور رنج و مصائب آفت و آلام بنائے گئے تھے۔ مجھے اور صرف مجھے برباد کرنے کے لئے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ ایک دن خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے (سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں) مجھے ثروت آرا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کیا بتاؤں اس کے دلکش چہرے پر حزن و ملال کا کیسا دل سوز نظارہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ آزردہ اور مجھ سے پہلے دُنیا کو اس مکار اور فریبی دُنیا کو خیرباد کہنے کے لئے تیار۔ اُسے بھی میری طرح چپ لگ رہی تھی۔ وہ بھی غم و الم کی اُسی منزل میں تھی جس میں کہ میں۔ یہ منزل، یہ جانکاہ اور ہلاکت بار منزل۔ خُدا اس سے دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ اپنے مسافر کو اپنی آغوش میں لے کر ہی چھوڑتی ہے۔ ہم پہ وہ زمانہ گزر چکا تھا جب انسان اپنی مصیبتوں کو دیکھ کر بیگانہ وار ہنس دیتا ہے۔ اس کے لئے غم، غم نہیں رہتا۔ وہ ہر نئے غم کا اور ہر نئی مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے اور بلند قہقہوں کے ساتھ استقبال کرتا ہے۔ خویش و اقارب اُس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ اب اسے کوئی رنج نہیں۔ مگر اب ایک گھن ایک رنج اسے اندر ہی اندر کھاتا

رہتا ہے اور یہ بلند قہقہے نہایت سُرعت کے ساتھ اسے ہلاکت کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیل لے جاتے ہیں۔ جب اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو اُسے چُپ لگ جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ اُف نہیں کرتا اور اسی کے بعد کا درجہ موت ہے۔ اگر اس حالت میں وہ اپنے دل کا رنج رد کر یا کسی ہمراز کو قصۂ غم سنا کر ہلکا نہیں کر لیتا تو یہ سمجھنا چاہئے کہ کہ موت اس سے نہایت قریب ہے۔

ثروت کی اور میری حالت بالکل یکساں تھی۔ نہ میرا کوئی ہمراز تھا نہ اُس کا ہمیں پیہم آفتوں اور مسلسل مصیبتوں کی وجہ سے چپ لگ رہی تھی اور ہم دونوں دعا کرتے تھے کہ خدا ہمیں جلد سے جلد اس "نامراد" دُنیا سے اٹھالے۔ پہلی ملاقات میں ایک دوسری کو اتنا زیادہ ہلاکِ غم دیکھ کر مجھے ثروت سے اور ثروت کو مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آہ ــــــ اس ہمدردی نے ہمیں اور زیادہ آفتوں میں مبتلا کر دیا۔ کاش ہم نا آشنا ہی رہتے اور ہماری زندگیوں کا، مصائب سے مملو زندگیوں کا کبھی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

اگر کسی کے سر میں بہت زیادہ درد ہو اور دوسرا شخص بھی اسی درد میں مبتلا ہو جائے تو جتنا وہ ایک دوسرے کے درد کو محسوس کریں گے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہی حال میرا اور ثروت کا تھا۔ میں جس کے ہوش و حواس رنج والم کی بارشوں نے اپنے طوفانوں میں کھو دیئے تھے۔ جسے قدرت نے صرف مصیبتیں اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا جس سے اُس کا محبوب ترین دوست۔ موت، ظالم اور سنگدل موت کے ہاتھوں زبردستی چھینا جا چکا تھا۔ یہ سمجھنے لگی کہ ثروت مجھ سے کہیں زیادہ ستم زدہ ہے۔

اور اگر میری زندگی کی قربانی سے اُس کے صدمات میں کچھ کمی آگئی تو یہ میری بقیہ زندگی کا بہترین مصرف ہو گا۔ اور ثروت کی باتوں سے بھی یہ پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے انتہائی ہمدردی رکھتی ہے۔

دو مہینے ایسے کٹے کہ کبھی میں ثروت کی مہمان ہوتی اور کبھی وہ میری۔ ہمیں آپس میں اتنی محبت ہو گئی کہ ایک کے بغیر دوسری کا حال بے حال ہونے لگا۔ میں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا لیا کہ ثروت کو مصائب کی خوفناک بلاؤں سے بچا لوں اور اس کام میں دنیا کے دوسرے جھگڑوں کو فراموش کر کے ہمہ تن مصروف ہو گئی۔ مجھے اپنے رنج یاد نہ رہے ثروت کو، ثروت کی خراب حالت کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔

ان دو مہینوں میں اُس نے مجھے اپنا ہمراز کامل طور پر تو نہیں بنایا۔ ہاں البتہ اپنی مصیبت کی داستان کے کہیں کہیں سے دو ایک ٹکڑے سنا دیئے اُس کی یہ بپتا سن کر مجھے اُس سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ میں بھی اس قسم کی مصیبت کا شکار تھی۔ اس کی صحبت سے میری مصیبت میں تو بہت کچھ تخفیف ہو گئی۔ مگر ثروت کی بیماری روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کا سا زرد ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور ضعف کا یہ عالم تھا کہ دس بیس قدم بھی نہ چل سکتی تھی میں اُس کی نازک حالت سے خائف رہنے لگی۔ اسے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ مگر ناکام رہتی۔ اسے رُلانا چاہتی مگر وہ خاموش بیٹھی رہتی۔ کئی کئی گھنٹے خاموش بیٹھی رہتی۔ میری منتیں، میری خوشامدیں، میری نصیحتیں سب بے اثر ثابت ہوتیں۔ کبھی یہ ہوتا کہ میرے لگاتار سمجھانے پر وہ اپنے نرم و گداز بازو میری گردن میں حمائل کر دیتی اور میرے شانے پر اپنا سر رکھ کر اپنی ناکامیوں

چند آنسو بہاتی اور بے ہوش ہو جاتی ——— بیہوش۔ یہ وقت نہایت خطرناک ہوتا۔ کیونکہ مجھے تنہا اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنی پڑتیں اگر کوئی اور اس اثنا میں اس کے متعلق پوچھتا تو میں کہہ دیتی آرام کر رہی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا میری جان گھٹتی جاتی۔ اور پھر نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہو گیا کہ ایک دن اسی بیہوشی میں یہ بدنصیب مجھ کو روتا چھوڑ کر اس ناپاک اور مکروہ دنیا سے منہ موڑ لے گی۔

ثروت کے والد چار سال پہلے جنت کو سدھار گئے تھے اور شاید اُسی وقت سے اُس کی اس بے کیف اور پُرغم زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب اُن کے گھر میں ثروت، ثروت کی والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ مجھے اس طرح ثروت سے وابستہ دیکھ کر سبھی مجھ سے محبّت کرنے لگے تھے۔ میرا یہ حال تھا کہ اگر ثروت سو رہی تو میں نے بھی کچھ دیر کے لئے آنکھ جھپکالی اور اگر وہ جاگتی رہی تو ساری رات اس کے ساتھ بیدار رہ کر گزار دی۔ غرضکہ جو کام کرنا وہ ثروت کے ساتھ اور اسے ذرا دیر کو تنہا نہ چھوڑنا۔ اسی طرح ہمارے گھر والے بھی اس کی قدر کرنے لگے کیوں کہ اس کی وجہ سے اور صرف اُس کی وجہ سے مجھ میں از سرِ نو زندگی آ گئی تھی۔ ورنہ کوئی ایسا نہ تھا جو میری زیست سے مایوس نہ ہو چکا ہو۔ انھوں نے ثروت کی صحبت کو غنیمت جانا کہ اس سے میری طبیعت بظاہر پہلے سے بہت بہتر تھی۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اگر ثروت جئے تو میں زندہ رہوں ورنہ اس کے ساتھ ہی میں بھی اس دنیا کو خیرباد کہہ دوں۔ ثروت پر دن رات ایک والہانہ بے خودی۔ ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی اور کبھی کبھی کسی خیال میں ایسی مست ہو جاتی اور اتنی بے خبر

کہ پاگل معلوم ہونے لگتی۔ میں ڈرتی کہ کہیں یہ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نہ بھاگ جائے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی چھت کو تکتی رہتی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے سفید سفید موتیوں کی لڑیاں بندھ جاتیں مگر اس شان سے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور لبوں پر مہر سکوت لگی ہے۔ اس کی اس بے بسی پر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی سینہ پھوٹ جائے گا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی، اُس کے خیالات کو بدلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اسی بے بسی سے میرے چہرے کو تکتی رہتی اور میں اس کی مجبوری اور ناچاری پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔

اُس کے پاس ایک تصویر تھی۔ میں ذرا دیر کو کہیں جاتی اور وہ فوراً اپنا سوٹ کیس کھول کر تصویر دیکھنے لگتی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ سوٹ کیس بند کر دیتی یا تصویر کو چھپا لیتی۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھا۔ مگر اُس نے کچھ نہ بتایا۔ میرے اس قسم کے سب سوالوں کا اُس کے پاس ایک جواب تھا ——— خاموشی، اور اُس کی اس خاموشی نے مجھے تنگ کر رکھا تھا۔ ایک روز بیٹھی تصویر کو نہایت انہماک کے ساتھ تک رہی تھی۔ میں دبے پاؤں گئی اور اس کی پشت کی جانب کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ اس نے جونہی تصویر کے آئینے میں میرا عکس دیکھا۔ فوراً تصویر کو کپڑوں میں چھپا دیا۔ اور خود سوٹ کیس کو بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ شاید یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ میں نے ہر چند خوشامد کی، کوشش کی، ضد کی کہ کسی طرح وہ مجھے اس تصویر کے متعلق کچھ بتا دے۔ مگر اُس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ نیچی

نظریں کئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد آنکھیں اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ آخر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور میں خاموش ہو گئی۔

میں نے اس عرصے میں اُس کے متعلق بہت عجیب باتیں سنیں۔ مگر اعتبار کبھی نہیں کیا۔ رشتہ دار تو ان کے بہت تھے اور تھے بھی قریبی۔ مگر "دوست" ایک بھی نہ تھا۔ ایک رشتہ دار تو خاص طور پر ان کی دشمن تھی۔ کم بخت نت نئے طوفان اٹھاتی رہتی تھی۔ مگر ثروت کی ذات ان کمینہ بہتانوں اور رذیل طوفانوں سے بہت بالاتر تھی میں نے اپنی ساری عمر میں ایسی معصوم اور پاکیزہ خصائل لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی۔ نمازی —— تہجد گزار —— ہر وقت قرآن شریف کی تلاوت، ہر دقت اپنے خیالوں میں محو رہنے والی اور دنیا سے بے تعلق۔ ثروت کی طینت اس کے رشتہ داروں سے بہت بلند تھی۔ اُس نے اُن کی کسی بات کا کبھی جواب نہیں دیا۔ اور جب میں پوچھا کرتی۔ تو عام طور پر چپ ہو جاتی۔ یا صرف اتنا کہتی "خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔

پہلے ثروت کو بہ ظاہر کوئی ایسا مرض نہ تھا جس کا طبیبوں سے علاج کرایا جا سکتا۔ کئی مرتبہ مشہور ڈاکٹروں اور نامور طبیبوں نے دیکھا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی کہتے رہے کہ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے اس کی وجہ سے یہ روز بروز سوکھتی جاتی ہے۔ دل کی تقویت کی دوائیں دیں۔ فرحتِ دماغ کے شربت پلائے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان کی ہدایت کے بموجب گھر کے ہر ایک فرد نے ثروت کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کے خیالات کو بدلنے کی سعی بھی، مگر اس کی حالت

سر مو فرق نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ بخار رہنے لگا۔ دن رات بدن تپتا رہتا۔ اور اس کی ہذیانی کیفیت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ اس مرتبہ پھر طبیبوں کی طرف رجوع کرنا پڑا اور سب نے متفق ہو کر تپ دق تجویز کیا۔ اس مرض کا، اس نامراد مرض کا نام سن کر ثروت کی زندگی کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ ثروت کو اپنی بیماری کا حال معلوم نہ ہو۔ مگر وہ تو بلا کی فہیم تھی۔ آثار و قرائن ہی سے سمجھ گئی اور کبھی کبھی موت کے خیال سے مطمئن سی ہو جاتی۔

اُس کی بیماری میں شب و روز اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے گھر والوں کی مالی حالت پہلے ہی ایسی اچھی نہ تھی کہ ایسے مہلک مرض کا اعلیٰ پیمانے پر علاج کرا سکتے دوسرے لگاتار بیماری نے انھیں اور زیادہ زیر بار کر دیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اُسے کسی طرح کسی پہاڑی مقام پر لے جاتے، بہت غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی کہ اپنے زیور وں کو بیچ کر ثروت کو پہاڑ پر لے جاؤں۔ میں نے انتظام کر بھی لیا تھا مگر ثروت کو عین وقت پر معلوم ہو گیا۔ اور اُس نے میری سب امیدوں پر پانی پھیر دیا وہ دھرم پور جانے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی اور میرے اصرار پر کہنے لگی "اگر تم مجھے زیادہ تنگ کرو گی تو یاد رکھو میں ضرور کچھ کر بیٹھوں گی"۔ یہ فقرہ ایسا نہ تھا کہ میں معمولی سمجھ کر ٹال دیتی۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ ثروت جو کہتی ہے وہ کر دکھاتی ہے اسلئے پھر میں نے اسے لے جانے کے لئے نہ کہا

اُس کی زندگی سے مایوسی تو سبھی کو ہو گئی تھی۔ مگر میرے لئے یہ مایوسی نہایت جاں گداز تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ثروت کا مرض مجھے لگ جائے میں نے نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگیں ـــــ اس کی چارپائی کے چکر کاٹتے ہوئے

التجائیں کیں کہ ثروت اچھی ہو جائے اور میں اس کی جگہ بیمار ہو جاؤں۔ مگر نہ دعائیں پوری ہوئیں نہ التجائیں۔

ایک دن رشتہ داروں میں ایک موت ہو گئی۔ ثروت کی والدہ وہاں چلی گئیں اور بھائی اسکول۔ میں اس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ ثروت کی طبیعت صبح سے بہت زیادہ پریشان تھی۔ اس کی حرکات وسکنات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہتی ہے پھر خود بخود رک جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک گھنٹے کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ہوا۔ ذرا دیر چپ چاپ پڑی رہی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہ سمجھی کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ کیونکہ پچھلی تمام رات اس کی نہایت کرب واضطراب میں جاگتے بسر ہوئی تھی میں اس کے پاس سے اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی مشکل سے دس منٹ گزرے تھے کہ اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"عطیہ!۔۔۔۔۔ عطیہ!!"

میں بھاگتی ہوئی اس کے قریب گئی اور پوچھا "کیا بات ہے؟" چند لمحوں کے سکوت کے بعد کہنے لگی "عطیہ! تم ایک مدت سے میری خدمت کر رہی ہو۔ خدا تم کو اس کا اجر دے ۔۔۔۔۔ افسوس میں تمہارے کسی کام نہ آسکی، تمہاری کچھ خدمت نہ کر سکی ۔۔۔۔۔ خدمت تو رہی ایک طرف تمہاری معمولی سی خواہش کو آج تک پورا نہ کر سکی عطیہ! اب شاید میری زندگی کی چند ساعتیں باقی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آج تم پر وہ راز افشا کر دوں جس کے معلوم کرنے کے لیے تم اتنی زیادہ بیتاب تھیں ۔۔۔۔۔ راز نہیں مصیبت کی کہانی ہے جو ۔۔۔۔۔"

نقاہت کی وجہ سے آگے نہ کہہ سکی۔ میں نے خیال کیا کہ اس نازک

وقت اس پُرغم قصّہ کا دہرانا ٹھیک نہیں۔ پچھلی رات سے اس کا حال بگڑا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے کہا

ثروت یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں۔ اور تم اپنی زندگی سے مایوس کیوں ہو گئیں۔ کل تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا بہت کچھ آرام ہے۔ خدا کرے گا پانچ دس دن میں طبیعت درست ہو جائے گی پھر سنا دینا"

اب بالکل آرام ہو جائے گا عطیہ! اب بالکل آرام ہو جائے گا۔ میں اندھی نہیں۔ سب کچھ دیکھتی ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں میں کئی روز سے ورم آگیا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ بلکہ منتظر ہوں اُس مبارک گھڑی کی جب میں دنیا کو بے وفا دنیا کو الوداع کہوں گی ——— خیر ہاں یہ وقت واقعی ان باتوں کا نہیں۔ یہ وقت خدا کی یاد کا ہے اور دوسرے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس پر درد کہانی کو سنا سکوں۔"

ثروت یہاں تک کہہ کر چھت کو تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے! اور اضطراب کی کچھ انتہا نہ تھی۔ میں نے کہا

ثروت! تم کیسی باتیں کرنے لگیں۔ خدا کے لئے اپنے دل سے اس خیال کو نکال دو۔"

ثروت رونے لگی اور روتے روتے ایسی بیہوش ہوئی کہ میری کئی گھنٹے کی کوشش بھی اسے ہوش میں نہ لا سکی۔ میں بہت زیادہ گھبرا گئی اور اس کی والدہ کے پاس اطلاع بھیج دی۔ وہ فوراً ڈولی میں آگئیں۔ ہم دونوں نے مل کر تدبیریں کیں مگر سب ناکام رہیں۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا وہ بھی دو ایک پچکاریاں لگا کر چلتا بنا۔ تیسرے پہر کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ ہوش کا آنا تھا کہ مجھ میں جان آگئی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو

میں نے کہا "آج تو خوب سوتی رہیں آپ! کب سے اٹھا رہے ہیں۔" اب
اٹھی ہیں ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہی پھر اپنی والدہ سے کہنے لگی
"امی جان! آپ کب آ گئیں" کچھ سوچ کر مجھ سے کہا "میں تو تہیہ کر کے سوئی
تھی کہ قیامت سے پہلے نہ اٹھوں گی۔ مگر تم نے اٹھا ہی لیا۔" میں نے خیال
کیا کہ یہ اپنی بیہوشی کو تاڑ گئی ہے۔ اس لئے نیند کے ذکر ہی کو چھوڑ دیا۔

دن بھر اس کا حال خراب رہا۔ بے چینی اور بے تابی کی کوئی حد
نہ تھی۔ شام سے خویش و اقارب اس کا حال دریافت کرنے آنے لگے۔
رشتہ دار عورتیں رات کے گیارہ بجے تک بیٹھی رہیں۔ ثروت کی طبیعت ان
کی باتوں اور ان کے بچوں کے شور سے اور زیادہ گھبرانے لگی۔ میں نے
بڑی خوشامدوں سے عورتوں کو سمجھایا۔ انھوں نے بُرا محسوس تو ضرور کیا
مگر اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی میں نے ثروت کو دوا پلائی۔ اور
اس کے قریب ایک چارپائی پر لیٹ گئی۔ دو تین دن سے میں صرف
دو ایک گھنٹے سو سکتی تھی۔ تھکی ماندی بھی تھی آنکھ لگ گئی۔ تین چار بجے جو
آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ثروت بیٹھی ہوئی لکھ رہی ہے اور اس کی والدہ
اور بھائی بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ میں کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کا
قلم اسی تیزی سے چلتا رہا۔ میں نے اٹھنا مناسب خیال نہ کیا۔ میں سمجھی کہ
کسی کو خط لکھ رہی ہو گی جس کی تصویر اس کے پاس ہے۔ میں پھر سو گئی۔
صبح کو اٹھی تو ثروت خلافِ معمول سوتی ملی۔ اس بیماری میں بھی وہ ہر صبح
گرتی پڑتی اٹھتی تھی۔ مگر نماز کبھی قضا نہ کرتی تھی۔ میں نے اس کی والدہ کو
جگایا اور خود نماز پڑھ کر قرآن پڑھنے لگی۔ میری آواز سن کر وہ بھی جاگ
پڑی اور شاید نماز کے قضا ہونے کے خیال سے گھبرا کر یک لخت کھڑی

ہو گئی۔ آہ طاقت نے ساتھ نہ دیا۔ چکرا کر گر پڑی۔ فرش میں سر لگا اور امی جان
کہہ کر بیہوش ہو گئی۔ ادھر سے میں لپکی اور ادھر سے اس کی والدہ ——
ایسے بُرے وقت گری تھی کہ پھر ہوش میں نہ آئی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے پینے
کی دوا دی انجکشن کئے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ دوپہر تک بیہوش رہی اور اس
کے بعد ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس مردار دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نزع کے
وقت شاید پانچ سات لمحوں کے لئے ہوش آیا تھا۔ آنکھیں کھول کر چاروں
طرف تکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ثروت! اب کیسی طبیعت ہے؟ وہ خاموش
رہی۔ جواب نہ پا کر میں نے پھر کہا کس کی تلاش ہے۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا اُسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتی رہی چہرے سے
وہی بے بسی برس رہی تھی اور معصومیت بھی۔ میں پھر بولی" ثروت! ثروت! تم
بولتیں کیوں نہیں؟ آنکھیں بند کر کے اس نے زیر لب کچھ کہا اور ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے خاموش ہو گئی۔

ثروت کی جوانا مرگ سے جتنا صدمہ مجھے پہنچا شاید اس کی والدہ کو
بھی نہ پہنچا ہو۔ میں پتھر بن کر رہ گئی۔ آنکھ ہی پھوٹے جو اس سے ایک آنسو بھی
نکلا ہو اور زبان ہی گل جائے جو ایک آہ بھی کی ہو۔ نیم غشی کی حالت میں
اس کے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ دیکھ سب کچھ رہی تھی۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکتی
تھی۔ اس کی والدہ چارپائی کے قریب بیٹھ کر رونے لگیں۔ بھائی سر پیٹنے
لگے۔ پڑوس کی عورتیں بھی آ گئیں اور آہ وزاریاں کرنے لگیں۔ ثروت کی والدہ
اُن کی آہ وزاریاں سن کر اور زیادہ زار وقطار رونے لگیں۔ مگر میں جوں کی
توں بیٹھی رہی۔ نظر سب کچھ آ رہا تھا لیکن رو نہ سکتی تھی۔ حرکت نہ کر سکتی تھی
بالکل بے بس تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر پہاڑ گر گیا ہے اور میرا جسم

چکنا چور ہو گیا ہے! ایک مرتبہ میں نے ساری طاقت کو جمع کر کے کھڑا ہونا چاہا ۔۔۔۔ اس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔ سورج غروب ہونے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے میری آنکھیں کھلیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ سب عورتیں مجھے حلقہ میں لئے بیٹھی ہیں۔ فوراً سب باتیں یاد آگئیں۔ آہ ثروت کو مٹی میں ملے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اس کی پیاری صورت کو آخری مرتبہ دیکھ بھی نہ سکی تھی۔۔۔۔۔ آہ میری عزیز ترین سہیلی آہ!

اتنے میں ثروت کی والدہ آئیں اُن کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذ تھا۔ مجھے دے کر کہنے لگیں "لو۔ یہ ثروت کا خط ہے تمہارے نام" پہلے تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں سمجھی کہ یونہی غم غلط کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ پھر جو کاغذ لیکر دیکھا تو ثروت ہی کی تحریر معلوم ہوئی۔ خط کا پڑھنا تھا کہ آنکھوں سے دو دریا اُمڈ آئے۔

ثروت نے لکھا تھا

پیاری عطیہ! ثروت کا، اپنی ناشاد اور مجبور ثروت کا آخری سلام قبول کرو۔ میں غالباً آج رات کی اور مہمان ہوں۔ تم چار مہینے میرے ساتھ رہیں اور ان چار مہینوں میں مجھ سے جتنی ہمدردی تم نے کی کوئی عزیز ترین بہن بھی نہیں کر سکتی یہ تمہاری ہی رفاقت کے طفیل تھا کہ میں اتنا عرصہ زندہ رہی ورنہ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی عطیہ! مجھے موت کا خوف نہیں مگر آہ تمہارے رنج و غم کا خیال کاٹے کھاتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھو مرتے وقت بھی اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ کاش میں بچپن ہی میں مرجاتی۔

تم میرا افسانہ غم سننے کے لئے بہت بے تاب تھیں۔ مگر میں ہمیشہ ٹالتی رہی۔ کل میں نے خود سنانا چاہا مگر تم نہ آئیں۔ صبح ہونے میں چند گھنٹے

باقی ہیں۔ کوشش کروں گی کہ سب واقعات کو مختصراً لکھ دوں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں۔ مگر تمہارے پیہم اصرار کی وجہ سے قلم اٹھا رہی ہوں۔ خدا کامیاب کرے۔ نقاہت مجبور کر رہی ہے کہ لیٹ جاؤں۔ ضعف زور دے رہا ہے کہ گر پڑوں۔ لیکن میں اپنی دھن میں مست سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں۔

عطیہ! آخری وقت میں ان باتوں کو یاد کرنا جو میری امن بربادی کا باعث ہوئیں۔ عقلمندی تو ہے نہیں۔ لیکن خواہ کچھ کہو اس وقت، پانچ سال پہلے کا زمانہ، فرحت و انبساط کا زمانہ، آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ دہلی کا مکان جنّت نشاں مکان، اپنی تمام مسرتوں کو جلو میں لئے میرے سامنے ہے۔ وہ وقت میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ احسان حسن و وفا کا پیکر احسان ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ والد اور والدہ کو رات کے وقت باتیں کرتے سنا کہ وہ مجھے احسان کے ساتھ بیاہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ ہمیں وابستہ تو ہونا ہی ہے اور اس کے علاوہ ایک ساتھ رہنا، سہنا، اٹھنا بیٹھنا رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی بہت جلد محبت نے عشق کا اور عشق نے جنون کا درجہ اختیار کر لیا۔ ہمیں باتیں کرنے کا وقت بہت کم ملتا تھا اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پیاری پیاری تحریریں۔ محبت بھرے القاب۔ میٹھے میٹھے الفاظ کیا لکھوں۔ اس کے خط پڑھ کر کیا مزا آتا تھا۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ مدت تک چھپی رہتی۔ آہستہ آہستہ میرے والدین کو بھی خبر ہو گئی۔ آہ۔ انھیں خبر ہونا ہی ہمارے حق میں زہر قاتل ہو گیا۔ جو باتیں محبت کی دنیا میں جائز ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگیں

ہمیں آنکھیں ملنے پر مسکراتا دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔
دو ایک دفعہ والدہ نے ہمیں خط لیتے دیتے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا شامت ہی آگئی۔ مجھے بھی دھمکایا اور احسان کو بھی۔ اور بہت زیادہ دیکھ بھال کرنے لگے۔ احسان نے اُن کے ہر روز کے بدلے ہوئے تیور اور دن رات کے جھگڑے سے تنگ آکر دوسری جگہ مکان لے لیا۔ کہاں ہر وقت کا ساتھ اور کہاں ہفتہ میں ایک بار ملاقات۔ یہ مصیبت مجھ سے اٹھائے نہ اٹھی
پیاری عطیہ! قصہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور میں مارے ضعف کے نڈھال ہو رہی ہوں۔ شاید سب باتیں نہ لکھی جا سکیں۔
اس کے بعد اور بہت سی مصیبتیں آئیں۔ اور میں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے دو مرتبہ کوشش کی، دو مرتبہ زہر کھایا۔ مگر کمبخت موت کو بھی مجھ بدنصیب پر رحم نہ آیا۔ دونوں دفعہ طبی امداد نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ احسان، آہ شہید محبت احسان۔ شادی کی آخری مرتبہ مگر تو ناکوشش کر کے بے پتا ہو گیا، گو میرا دل کہتا ہے کہ احسان زندہ ہے۔ لیکن یہ خبر نہیں کہ مایوسی نے اسے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔ خیر کچھ دیر میں میری روح اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ تمہاری ثروت کی یاد اُس کے دل میں ہے اور تمہاری ثروت کا سودا اس کے سر میں۔ عطیہ! میں نے اور احسان نے ایک زرّین شام کو عہد کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احسان اب تک اس عہد پر قائم ہے اور جیتے جی قائم رہے گا۔ اور میں، میں نے انتہائی کوشش کی۔ آہ بے بس کیا اور بے بس کی کوشش کیا؟ —— یہ بھی بجائے خود ایک طویل قصہ ہے۔

دل کی حرکت لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ چند لمحوں ہی میں بلّیوں اچھلنے لگا ہے۔ طبیعت پر سخت پریشانی چھا رہی ہے اور دماغ پر ایک عجیب قسم کا بار محسوس ہو رہا ہے۔ آہ سچّی محبّت کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ خبر نہیں خدا کیوں اس میں خوش ہوتا ہے کہ سچّی محبّت کرنے والے برباد ہوں، مٹ جائیں۔ لیکن رہیں ناکام ہی۔ عطیہ! میں نے ہر امکانی کوشش کی۔ والدہ سے بالکل صاف صاف بھی کہا۔ اور لکھ کر بھی دیا۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔

عطیہ! اب مجھ سے بالکل نہیں بیٹھا جاتا۔ سر بہت ہی زیادہ گھومنے لگا۔ ہر چیز گھومتی نظر آرہی ہے۔ اب ایک عجیب تاریکی تسلط کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ لیمپ بھی تاریک نظر آنے لگا ہے۔ اچھا رخصت!"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا۔ اور ہر مرتبہ دل کو پہلے سے زیادہ رنج پہنچا۔ آہ ثروت۔ دوسروں کی جہالت کا شکار ہو کر یوں خاک میں مل گئی۔ یوں برباد ہو گئی۔ ثروت جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی شاید صدی میں ایک ہی دفعہ پیدا ہوتی ہو۔

اب میری کیا حالت ہے۔ اس کی مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی نہیں رہا جو خوشی اور غم کو محسوس کر سکے۔ اور نہ کوئی آرزو، ایک آرزو ہے بھی —— موت کی —— کاش میں ثروت کے ساتھ مرجاتی۔ کاش میں ثروت کے ہمراہ سفر کر سکتی۔ کاش ہم ایک ساتھ اس دنیا سے، اس رنج و غم کی دنیا سے رخصت ہوتے۔ ثروت کے بعد میری زندگی بالکل بے لطف ہو گئی ہے۔ ثروت نہ کیا گئی۔ میری خوشی کو اور صرف میری ہی کیا تمام دنیا کی خوشی کو اپنے ساتھ

لیتی گئی۔ جسے دیکھو وہی غمگین نظر آتا ہے۔ جسے دیکھو اُسی کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ درودیوار سے حسرت و مایوسی برستی معلوم ہوتی ہے۔ خبر نہیں ثروت کے بعد کیوں سارے زمانے میں رنج، حسرت، حرمان نصیبی اور مایوسی مستولی ہو گئی، اور نہ جانے کس لئے ثروت کے جاتے ہی تمام عالم سے مسرت و راحت یک لخت رخصت ہو گئی۔
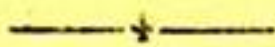
ڈاکٹر شوکت

گو ڈاکٹر شوکت کی طبیعت پریشان تھی اور کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ پھر بھی صبح سویرے سے اٹھتے ہی اس نے اپنے روز کے معمول کے مطابق کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے چائے پیتے ہی وہ اُن بیماروں کو دیکھنے گیا جو اس کے اسپتال میں ٹھیرے ہوئے تھے اور ہر روز کی طرح اُس نے اُن کی دلجوئی کی اور ہمت بندھائی۔ لیکن خود اسے بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بے ربط فقرے زبان سے نکل رہے ہیں اور مُسکراتے ہوئے تو خاص طور پر تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی۔ دو نرسیں ساتھ تھیں جنھیں وہ ہر مریض کے متعلق ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔ ہدایتیں دیتے ہوئے البتہ وہ بہت احتیاط سے کام لیتا۔ تاکہ اسٹاف کے کسی آدمی پر اس کی دلی پریشانی ظاہر نہ ہو سکے۔ ان مریضوں سے فراغت پائی ہی تھی کہ اسسٹنٹ ڈاکٹر آیا اور اُس نے بتایا کہ ایک بہت غریب آدمی کا اپریشن کرنا ہے۔ شوکت مُسکراتا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اپریشن بہت سخت اور بہت نازک تھا۔ اُس میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو دیکھا کہ بیماروں اور بیماروں کے رشتہ داروں کی بھیڑ لگ رہی ہے اور سب اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

مسکراتا ہوا جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور حال پوچھ پوچھ کر دوائیں تجویز کرنے لگا
کسی نے کہا ڈاکٹر صاحب رات کو نیند بالکل نہیں آتی۔ کسی نے کہا مریضہ کا
بخار تو اتر گیا۔ لیکن صبح سے اسے غوطے پڑ رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر
کے بعد بیہوش ہو جاتی ہے اور جسم ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔ وہ ان کا حال
سن سن کر نسخے لکھتا رہا۔ یا پہلے نسخوں میں مناسب ترمیم تنسیخ کرتا رہا۔
گیارہ بجے کے قریب جب اہل درد کی بھیڑ کم ہوئی تو ایک بوڑھا آدمی اپنے
نوجوان مگر کمزور لڑکے کو لے کر آگے بڑھا اور سلام کر کے بولا۔ ڈاکٹر صاحب
اسے خبر نہیں کیا ہو گیا۔ روز بروز سوکھتا جاتا ہے۔ ہزار علاج کرائے۔ مگر
اس کی حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔ آپ کا نام سن کر بڑی دور سے
آیا ہوں۔ ساری عمر کی بس یہی کمائی ہے۔ اگر پرماتما نہ کرے اسے کچھ ہو گیا
——" فرط غم سے اس کی آواز حلق ہی میں رک گئی۔

ڈاکٹر نے نوجوان کو اپنے قریب بلایا۔ پہلے نبض دیکھی پھر آنکھوں کے
پپوٹے دیکھے اور پھر آلے سے اس کے دل اور پھیپھڑوں کا معائنہ کیا۔ ایک
پھیپھڑا کچھ اثر لئے ہوئے تھا۔ اور نبض بھی کچھ تیز تھی۔ لیکن اس نے انھیں
یہ بات نہ بتائی۔ بلکہ کہا۔ "بڑے صاحب، بظاہر تو آپ کے لڑکے کو کوئی تکلیف
معلوم نہیں ہوتی۔ بوڑھا بولا "سب یہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ آخر روز بروز سوکھتا
کیوں جاتا ہے۔"

شوکت نے کہا اس کے متعلق میں اس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا
چاہتا ہوں۔ بوڑھا بولا "تو میں ذرا دیر کو ایک طرف چلا جاتا ہوں۔" لیکن
شوکت نے جواب دیا۔ "نہیں آپ یہیں بیٹھے رہئے۔ یہاں ہمیں تنہائی میسر
نہیں آسکتی ہیں اسے اپنے کمرے میں لے جاتا ہوں۔"

اس کا خیال صحیح نکلا۔ لڑکے نے کچھ پس و پیش کے بعد اپنے دل کے روگ کے متعلق بتا ہی دیا۔ اُسے کالج کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ پھر کسی طرح لڑکی کے ماں باپ کو ان کی محبت کی خبر ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں انھوں نے اُسے اس کالج سے اٹھا کر دوسرے کالج میں داخل کرا دیا دو تین مہینوں کے بعد یہ بھی جا کر اُسی کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں داخل ہو کر اسے پتہ چلا کہ وہ کسی اور لڑکے سے محبت کرنے لگی ہے۔ وہ لڑکا کسی بہت امیر آدمی کا بیٹا تھا۔ کار میں کالج آتا۔ کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تو گھر چلا جاتا۔ کار تو ہر وقت کھڑی ہی رہتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی بھی فرصت ملی تو کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ سرلا بھی اکثر اس کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ قصہ مختصر اس نے بڑی مشکل سے وہ سال پورا کیا۔ اور اس کے بعد پھر آ کر اپنے پہلے کالج میں داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے اس کی داستان محبت سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طبیعت تو پہلے ہی پریشان تھی۔ کوشش کرنے پر بھی ضبط نہ کر سکا اور لڑکے نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے۔ اس کے آنسو دیکھ کر لڑکے کو محسوس ہوا کہ غم آدھا رہ گیا ہے اور وہ ڈاکٹر کو بہت ہی نرم دل اور بہت ہی نیک باطن سمجھنے لگا۔ اُس کا نام اور شہرت تو پہلے بھی سنی تھی۔ مگر وہ اسے اتنا نیک دل، اتنا صاحب درد کبھی نہ سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا "آج کل آپ کیا کرتے ہیں۔ یعنی آپ کا شغل کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تقریباً بیکار ہی رہتا ہوں۔ کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا ہر وقت سرلا یاد آتی رہتی ہے۔ اور اس کی یاد سے دل پر آرے سے چلنے لگتے

ہیں۔ اور میں بے قرار ہو جاتا ہوں۔ اُس کی بے وفائی یاد کر کے میرے تن
بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔"

ڈاکٹر نے تشفی کے انداز میں کہا "دیکھئے سرلا نے آپ سے کوئی بیوفائی
نہیں کی۔ آپ کی محبت ابھی خام تھی۔ یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ اپنی محبت
کو اتنا پختہ نہ کر سکے۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس نے امیر لڑکے کو صرف امیر ہونے کی
وجہ سے آپ پر ترجیح دی۔ عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے۔ تو وہ امیر
غریب کو نہیں دیکھتی اور ایک مرتبہ جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے
تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کی محبت کا رُخ دوسری طرف نہیں پھیر سکتی۔
خیر ان باتوں کو چھوڑیئے۔ اب تو آپ یہ سمجھئے کہ محبوب کو حاصل کرنا ہی محبت
کی غایت نہ ہونا چاہیئے۔ کیا آپ اس سے جب کہ وہ کسی اور کی بن چکی ہے
محبت نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے ہیں تو اس سے محبت کئے جایئے۔ اور یہ سمجھتے
رہیئے کہ اس دُنیا سے بہتر دُنیا میں آپ اس سے مل جائیں گے۔ اور بیکار ہرگز
نہ رہیئے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہیئے۔ کسی نہ کسی کام میں لگے رہیے اپنے دل
میں سرلا کی محبت کو اتنا عروج دے لیجئے کہ ہر آدمی میں آپ کو سرلا کا حسن
دکھائی دینے لگے اور پھر خلقِ خدا کی خدمت کیجئے۔ ایسا کرنے سے بنی نوع انسان
کی خدمت کرنے سے آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ آپ سرلا کی خدمت
کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر کی باتیں سن کر نوجوان کی آنکھیں سی کھل گئیں۔ اسے ایک
روشنی، ایک نہایت دلکش اور دلفریب روشنی دکھائی دینے لگی، ایسی
روشنی جس نے اس کی زندگی کے تاریک ترین حصہ کو بھی منور کر دیا۔
پھر اس نے دیکھا کہ وہ روشنی دراصل سرلا کی پُر نور پیشانی سے نکل رہی تھی

جب وہ اور ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلے تو وہ مطمئن تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر —— ڈاکٹر کی طبیعت پہلے سے بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ چلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ تاہم اُس نے نوجوان کے باپ کو تسلی دی کہ اب آپ کا لڑکا بالکل تندرست ہو جائے گا۔ اور ایک نسخہ بھی لکھ دیا اور کہا کہ یہ دوا کم سے کم ایک ہفتہ کی لے جاؤ۔ تین خوراکیں ہر روز دودھ سے دے دیا کرنا۔ اور دودھ اور تازہ مکھن اسے خوب کھلاؤ۔ اور کبھی خالی نہ بیٹھنے دو۔

ان کے جانے کے بعد شوکت نے اسسٹنٹ ڈاکٹر کو بلایا اور کہا کہ میرے لئے ایک "ڈوز" بنا لاؤ۔ اسسٹنٹ جانتا تھا کہ مہینے میں ایک آدھ دفعہ ڈاکٹر کو دل کا دورہ پڑ جاتا ہے، اس لئے بڑی احتیاط سے دوا تیار کی اور لا کر اُسے پلا دی۔ دوا پی کر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ گھر جا کر اُس نے ملازم کو ہدایت کی کہ آج ہماری طبیعت خراب ہے۔ ہمیں چار بجے سے پہلے نہ بلانا۔ باورچی کھانے کے متعلق دریافت کرنے آیا تو انکار کر دیا۔

آرام کمرے میں ملازم نے اُس کے کپڑے بدلوائے۔ کپڑے بدل کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ لیا۔ تنہائی اور فرصت ان دو چیزوں سے وہ ہمیشہ کتراتا تھا۔ لیکن جب دل کی تکلیف ہو جاتی تو انہی دو چیزوں سے اسے آرام پہنچتا۔ فرصت اور تنہائی گویا دو دوائیں تھیں جن سے اُس کی بیماری دور ہو جاتی۔ یا کم از کم اس کی شدت بہت کم ہو جاتی تھی لیکن نہیں —— فرصت اور تنہائی سے اُس کے دکھ میں کمی واقع نہ ہوتی تھی۔ بلکہ اس میں اور اضافہ ہو جاتا تا کہ اس کی ساری زندگی درد بن کر رہ جاتی۔ لیکن یہ درد بڑا خوش گوار ہوتا۔ اور اس کی خوش گوار ہی ہی میں وہ اپنی تکلیف

بھول جاتا۔ فرصت اور تنہائی میں اسے اختر کا خیال آتا۔ یوں تو ہر وقت ہی اختر اس کے خیالوں میں بسی رہتی لیکن تنہائی اور فرصت میں یہ خیال اور زیادہ تیز، اور زیادہ متشکل ہو جاتا اور اس کے جسم کا رواں رواں اختر اختر پکارنے لگتا۔ لیکن اختر —— اختر اس کی نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم اختر نے اسے وہ سب کچھ بنا دیا تھا جو کچھ وہ تھا —— ایک ہر دل عزیز ڈاکٹر جس نے فرشتہ بن کر خلق خدا کی خدمت کی اور سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں آدمیوں کو خوفناک اور جان لیوا بیماریوں سے نجات دلائی۔ اور پھر کبھی کسی سے حق خدمت طلب نہیں کیا۔ جو کچھ کسی نے دیا بخوشی لے لیا اور وہ بھی اس لئے کہ یہ کام، یہ خدمت کا ادارہ چلتا رہے اور زیادہ سے زیادہ غریب آدمیوں کی خدمت کی جا سکے۔

گرد و نواح کے لوگ اس کے نام پر اپنی جانیں چھڑکتے تھے۔ لیکن وہ خود اپنی جان سے، اپنی زندگی سے آزردہ تھا۔ اور یہ آزردگی۔ یہ بیزاری اختر سے وابستہ تھی۔ اگر شوکت کو غریبوں کی تکلیفوں کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اس نے اپنی زندگی کبھی کی ختم کر لی ہوتی۔ اور اسی لئے وہ ان غریبوں اور محتاجوں کا اتنا خیال کرتا کہ بعض دفعہ اسے سارا سارا دن کھانا کھانے کی فرصت تک نہ ملتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کھانا کھانے بیٹھا اور قریب کے گاؤں سے آدمی کسی نازک حالت والے بیمار کو لے آئے تو کھانا چھوڑ چھاڑ کر اسے دیکھنے لگ جاتا اور جو کچھ ممکن ہوتا اس کے لئے کرتا۔ اور پھر اپنے اسسٹنٹ اور نرسوں وغیرہ کو بے وقت تکلیف نہ دیتا۔ اُن کے فرائض بھی خود ہی انجام دے لیتا۔ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اس کا اپنا دکھ اس کی اپنی بیماری بڑھتی گئی۔ جو دوا اس نے اپنے لئے تجویز کی تھی۔

اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حالانکہ دوسروں کو اگر وہ خاک کی چٹکی بھی دے دیتا تو خدا انھیں اس خاک کی چٹکی سے اچھا کر دیتا۔ اور جتنا زیادہ مصروف رہتا اتنا ہی زیادہ اُسے محسوس ہوتا کہ اختر اُس کی مصروفیت کا مضحکہ اُڑا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ شوکت تم مجھے نہیں بھول سکتے۔ اپنی اس ناکامی پر، اپنی اس شکست پر شوکت کا دل بھر آتا اور وہ زیادہ عزم کے ساتھ اختر کو بھولنے کی ترکیبیں سوچنے لگتا۔

اختر اس کی زندگی میں خود ہی آئی تھی اور خود ہی چلی گئی تھی۔ لیکن جاتے ہوئے وہ اس کے دل میں ایک ایسا ناسور چھوڑ گئی تھی جو کسی صورت بھی مندمل ہونے میں نہ آتا تھا۔ میڈیکل کالج سے مہارت تامہ لے کر وہ کالج کے متعلقہ اسپتال میں ایک سال کے لئے ہاؤس سرجن مقرر ہو چکا تھا۔ ایک شام یہ اپنے ایک دوست کے یہاں چائے پر مدعو تھا۔ یہ، دوست اور دوست کی بہن بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اختر آئی۔ دوست کی بہن نے کھڑی ہو کر اس کا استقبال کیا اور اپنے برابر بٹھاتے ہوئے شوکت سے اس کا تعارف کرا دیا یونہی رسمی تعارف۔ آپ ڈاکٹر شوکت ہیں، میو اسپتال کے ہاؤس سرجن۔ آپ مس اختر ہیں، میری سہیلی۔ اس سال بی اے کا امتحان دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر شوکت اپنی کرسی سے تعظیماً اٹھا، کچھ آگے جھکا اور بیٹھ گیا۔ اختر بڑی چنچل تھی، بولی "میں رسمی قیود کی پابند تو ہوں نہیں کہ کہوں "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" بہرحال مجھے آپ سے ایک کام ضرور لینا ہے۔ کچھ دنوں سے مجھے آنکھوں میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے تو ——

اور شوکت نے کہا "تو آپ مجھے آنکھیں دکھائیں گی؟"

اس بات پر وہ ہنس پڑے۔

اور دوسرے دن اختر شوکت کے پاس اسپتال پہنچ گئی وہ نہایت اچھی طرح پیش آیا آنکھوں کے اسپیشلسٹ سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کرایا اور جو دوا اس نے تجویز کی وہ خود جا کر اسپتال کے اسٹور سے لادی اس کے بعد کئی دفعہ وہ اپنی آنکھیں دکھانے آئی اور کئی دفعہ شوکت کو اس سے ملنے کا اتفاق ہوا اور کئی دفعہ اس کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کر کے شوکت کو محسوس ہوا کہ اختر نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اس انکشاف پر اُسے سخت تعجب ہوا وہ اپنے دل کو "عشق پروف" سمجھتا تھا۔ کیونکہ ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں سے وہ کبھی متأثر نہ ہو سکا۔ حالانکہ دوسرے طالب علم ان کے پیچھے مارے مارے پھرتے، کئی دفعہ ملنے کے بعد وہ اس سے کافی بے تکلف ہو گیا۔ اور ایک روز اس نے اختر کو سینما چلنے کی دعوت دے ہی دی۔ چائے تو وہ اسے تین چار مرتبہ پہلے ہی پلا چکا تھا جب وہ دوسری دفعہ آنکھیں دکھانے آئی تو معائنہ کے بعد یہ اسے اپنے کوارٹر میں لے گیا وہاں آناً فاناً میں اس کے نوکر نے چائے تیار کر دی۔ نوکر کی پھرتی پر اُس روز پہلی بار اسے افسوس ہوا۔ ورنہ یہ ہمیشہ اس کی اس خوبی سے خوش ہوتا تھا۔ اُس روز یہ چاہتا تھا کہ نوکر بہت ہی سست ہو جائے اور یہ اختر سے باتوں کے دوران میں نوکر کی سستی پر آہستہ آہستہ اسے لعنت ملامت کرتا رہے لیکن اس نے اتنی جلدی چائے تیار کر دی کہ شوکت کو اختر سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس کے بعد جو وہ آئی تو شوکت نے اسپتال جاتے ہوئے نوکر کو ایک لمبے کام پر بھیج دیا تھا۔ اُس دن اُس نے خود اختر کے لئے چائے بنائی اور اس میں کافی سے زیادہ دیر لگ گئی۔

اختر کہتی بھی رہی کہ لائیے میں بنا لیتی ہوں۔ یہ کام تو عورتیں ہی اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ لیکن شوکت نے اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ اس نے زیادہ اصرار کیا تو کہدیا کہ آپ کو چونکہ تکلیف ہے اس لئے آپ کی آنکھوں کو آگ کی آنچ یا دھواں نہ پہنچنا چاہیے۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے زیادہ گرویدہ ہو گئے اور تقریبًا ہر روز ملاقاتیں ہونے لگیں۔ شوکت کو اختر میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتیں اور اختر بھی شوکت کو بہت اچھی نظروں سے دیکھتی۔ پھر ایک دن اختر نے بتایا کہ اس کا ایک رشتہ دار ولایت سے آئی سی ایس کا امتحان دے کر آ رہا ہے اس لئے شاید دو چار دن ملاقات نہ ہو سکے۔ یہ سن کر ایک دم شوکت کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے یک لخت کئی سوال کر ڈالے۔ اختر نے ہنس ہنس کر جواب دیئے اور چلی گئی۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد اختر کہیں نظر نہ آئی اس کی ملاقات کو جتنے دن گذر جاتے تھے یہ اتنا ہی زیادہ بے چین ہوتا جاتا تھا۔ لیکن پھر اس کی ایک جھلک بھی نظر نہ آ سکی۔ آخر تنگ آ کر اس نے اسے ایک خط لکھا جس میں اپنی محبت کا۔ اُن عہد و پیمان کا واسطہ دیا جو وہ آپس میں باندھ چکے تھے اور صرف ایک بار ملنے کی درخواست کی لیکن خط کا بھی جواب نہ آیا اسے حیرت تھی کہ اختر اتنی جلدی کیسے بدل گئی۔ وہ اختر جس نے خود اپنی بے پناہ محبت کا اعتراف کیا تھا۔ وہ اختر جس نے کہا تھا کہ میں سخت ترین مخالف حالات میں بھی تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ وہ اختر کیسے بدل گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تلخی محسوس ہوئی اور اپنی مجبوری کا صحیح معنوں میں احساس بھی پہلی ہی مرتبہ ہوا۔ پھر اس نے سوچ سوچ کر اپنے اس دوست سے اختر کو چائے پر بلانے کے لئے کہا جن کے یہاں کہ

اختر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ لوگ بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آئی۔ آخر دوست کی بہن کو اسے لینے کے لئے بھیجا۔ وہ اس کے ساتھ بھی نہ آئی لیکن شوکت کے نام اس نے ایک مختصر سا خط ضرور بھیجدیا۔ "مجھے بھول جائیے میں نے جب آپ سے عہدو پیمان کئے تھے تو میں بھول گئی تھی کہ مجھ پر ماں باپ کے بھی حقوق ہیں۔ ان حقوق نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جاؤں۔ خُدا کے لئے آپ میرے صبر و سکون پر جو یہ مجبوری اختیار کئے گئے ہیں۔ بجلی گرانے کی کوشش نہ کیجئے۔"

کچھ عرصے کے بعد جب ہاؤس سرجنی کی مدت ختم ہو گئی تو اس نے ایک ایسے اخبار میں جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ اختر ضرور پڑھتی ہے اپنی موت کی خبر نکلوادی اور خود لاہور سے بہت دور ایک چھوٹے سے قصبے میں اپنی پسند کا ایک اسپتال بنوایا۔ اور غریبوں، محتاجوں اور بیکسوں کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا اسپتال اور وہ خود دور دور مشہور ہو گئے۔ گورنمنٹ نے اس کی خدمت سے خوش ہو کر اس کے اسپتال کے لئے کچھ امداد پیش کی جو اس نے بخوشی منظور کر لی اور اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے لگا۔

آرام کمرے میں پلنگ پر لیٹا ڈاکٹر شوکت یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اس سے پہلے اس کا دل کم سے کم اپنے ان کاموں سے مطمئن ضرور ہو جاتا تھا۔ لیکن اُس دن اُسے یہ اطمینان بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس نے سوچا کہ مجھے یہ سب بکھیڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر اختر کی یاد میں زندگی گذار دینی چاہیے تھی۔ اختر کی یاد کے ساتھ اسے اُس

نوجوان کی یاد بھی آگئی جسے اُس نے نصیحت کی تھی " اپنے دل میں سرلا کی
محبت کو اتنا عروج دے دیجئے کہ ہر آدمی میں آپ کو سرلا کا حُسن دکھائی
دینے لگے " وہ نوجوان اس کی نصیحت سے کتنا مسرور ہو گیا تھا لیکن جب
وہ اس پر عمل کرے گا تو اسے حقیقت معلوم ہو گی کہ اس طریقۂ علاج سے تو مرض
کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گیا۔

یکایک شوکت کو کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ جو باہر ملازم سے
جھگڑ رہی تھی، وہ ایک دم اٹھا، لمبا سفید کوٹ پہنا اور باہر چلا گیا۔ باہر
پہنچتے پہنچتے اس نے سنا عورت کہہ رہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ ایک
آدمی کی زندگی اور موت کا سوال ہے نوکر کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب آرام کر رہے
ہیں چار بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکتے۔ عورت نے کہا۔ وہ پھر بھی آرام کر سکتے
ہیں۔ نوکر نے جواب دیا۔ لیکن آج ان کی طبیعت خراب ہے۔ عورت کی
آواز ڈاکٹر شوکت کو پہلے سنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ باہر آیا تو سامنے خیالوں
کی ملکہ کھڑی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دل کی حرکت ایک
دم تیز ہو گئی۔ اختر نے بھی اسے سخت حیرت اور تعجب سے دیکھا لیکن وہ
پہچان نہ سکی۔ اُس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کی موٹر سائیکل ایک موڑ پر
الٹ گئی اور وہ اُسی جگہ فوراً ہی مر گیا۔ کچھ اس کی داڑھی نے پردہ پوشی کی
شوکت نے اپنے مرنے کی خبر اخبار میں نکلوانے کے بعد داڑھی رکھ لی تھی
اور بالکل ناک کی سیدھ میں مانگ نکالنے لگا تھا۔ ورنہ ہاؤس سرجنی کے
زمانے میں داڑھی اور مونچھیں صفاچٹ تھیں اور سر کے بال بغیر عارض
نکالے پیچھے کی طرف الٹائے رکھتا تھا۔ اُس نے انگریزی میں پوچھا "میں
آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" اور بولتے ہوئے اس نے اپنا لب و لہجہ بد

بدل لیا۔ تاکہ اختر آواز سے بھی نہ پہچان سکے۔

اختر نے کہا "میرا شوہر اور میں کار میں اس طرف سے جا رہے تھے انھوں نے کار پوری رفتار پر چھوڑ رکھی تھی۔ سامنے سے ایک نوجوان سائیکل پر آ رہا تھا! انھوں نے بہتیرا بچانا چاہا، لیکن نوجوان آگے آ ہی گیا! انھوں نے ایکدم کار موڑی اور کار جا کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر تھی۔ اس لئے بچ گئی۔ لیکن ان کے سخت چوٹ آئی۔ حیران تھی کہ کیا کروں سائیکل والا بھاگ گیا تھا۔ خدا نے ایک تانگہ بھیج دیا۔ اس میں انھیں ڈال کر لائی ہوں۔ جلدی دیکھئے۔"

وہ سخت پریشان ہو رہی تھی۔ شوکت نے اس کے شوہر کا معائنہ کیا اور نوکروں کو بھیج کر نرسوں اور اسسٹنٹ ڈاکٹر کو بلا لیا اور اختر کو تسلّی دی کہ اطمینان رکھئے یہ بچ جائیں گے۔ گو چوٹ سخت آئی ہے۔ لیکن نا امید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

اختر بضد تھی کہ اپریشن کے وقت وہ بھی اپریشن روم میں رہے۔ لیکن شوکت نے کہا کہ اپریشن سخت ہے اس لئے آپ نہ دیکھ سکیں گی۔ اس کے علاوہ آپ کے دل کو پہلے ہی صدمہ پہنچا ہوا ہے۔ لہذا اختر کو اس نے اپنے یہاں بھیج دیا۔ اور نوکر کو تاکید کر دی کہ ان کے غسل کے لئے گرم پانی کر دے اور چائے بنا دے۔

نرسیں اپریشن کے آلات وغیرہ تیار کر رہی تھیں۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر نے کمپاؤنڈر کی امداد سے مریض کو میز پر لٹا دیا تھا۔ ہر طرف ایک یاس انگیز سکوت طاری تھا۔ ڈاکٹر شوکت ایک کونے میں متفکر کھڑا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اُس کا رقیب نیم مردہ حالت میں

میز پر پڑا تھا۔ اور اسے اپریشن کرنا تھا۔ اپریشن کرتے وقت قینچی یا چاقو ضرورت سے زیادہ چلانے میں رقیب کا کانٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل سکتا ہے اور مجھ پر کسی کو شبہ تک بھی نہ ہو گا۔ یا اپریشن کئے بغیر ہی اپریشن میں اگر ایک گھنٹہ کی دیر اور کر دی جائے تو بھی یہ روڑا راستے میں سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ پھر میرے اور اختر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو گی۔ جب تک یہ ولایت سے نہ آیا تھا۔ اختر میری تھی۔ اس نے آتے ہی میری دنیا بدل کر رکھ دی۔ اس نے مجھ سے میری زندگی کی عزیز ترین چیز چھین لی تھی! اب میری باری ہے۔ جب اس نے میری پروا نہ کی تو میں کیوں اس کی پروا کروں ——— لیکن اسے تو میری خبر نہ تھی! اسے کیا معلوم کہ اختر کسی اور سے عہد و پیمان کر چکی ہے۔ یہ اختر کی غلطی ہے اسے بتا دینا چاہئے تھا۔ اس نے نہیں بتایا تو اسے اس کی سزا ملنی چاہئے اور اس کی سزا یہی ہے کہ اس کے شوہر کو مر جانے دیا جائے۔ خدا نے شاید میری تنہائی اور خوشی سے خالی زندگی پر رحم کھا کر یہ حادثہ رونما کیا ہے۔ خدا نے اس سکھ کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا کہ وہ ان کی کار کے آگے آئے اور پھر کار جا کر درخت سے ٹکرا جائے۔

وہ سوچتا رہا۔ کسی کو مجھ پر شبہ تک نہ ہو گا۔ اختر اس کی موت کا رنج تو ضرور کرے گی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اسے بھول جائے گی۔ اور پھر اس کے دل میں اپنے بھولے ہوئے انتخار کی محبت عود کر آئے گی اختر کے ملنے کے خیال سے وہ بیخود سا ہو گیا لیکن پھر اس نے سوچا کہ اگر اختر اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے لگی ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے اس سے والہانہ محبت نہ ہو گئی ہو تو اس کے دل پر اس کی موت سے کیا گذرے گی

وہ جو اس کی چوٹ رہی ہے، اُس کی موت کے خیال ہی سے کانپ رہی ہے جب دراصل اس کی موت واقع ہو جائے گی تو اس کا کیا حال ہو گا۔ مجھے تو اس نے مرا ہوا سمجھ رکھا ہے۔ اور اگر میں نے اپنے آپ کو ظاہر بھی کر دیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ مان لیا کہ قانون میرا کچھ نہ کر سکے گا۔ لیکن اختر کی نظروں میں میں اپنی بریت کیسے ثابت کر دوں گا اور پھر اس کی نفرت اس کی ملامت ریز نگاہیں برداشت کرنے کی طاقت کس میں ہو گی۔ میں جو آج تک خلقِ خدا کی خدمت کرتا رہا آج اس خدمت سے میرے قدم متزلزل کیوں ہیں۔ اگر میری ذرا سی کوشش سے اختر کے ۔۔۔۔۔ میری محبوب کے پیارے شوہر کی جان بچتی ہے تو میں اس میں بخل سے کام کیوں لوں۔ اور اس کے علاوہ جان بوجھ کر کسی کی جان لینا ایک ایسا ذلیل کام ہے۔ جسے خود میرا ضمیر بھی شاید کبھی معاف نہ کر سکے اور وہ زندگی کس کام کی جس میں ضمیر ہمیشہ لعنت ملامت کرتا رہے۔ پھر وہ زندگی کاہے کی ہو گی وہ تو جلتے ہوئے انگاروں پر لوٹنا ہو گا۔

اُس نے خدا کا نام لے کر اپریشن شروع کیا اور بڑی احتیاط سے کام کرنے لگا۔ اب اس کے دل میں ایک آہنی عزم نے جگہ پکڑ لی تھی۔ اب وہ پوری توجہ سے اپنے کام میں منہمک تھا۔ دل کے دورے کی تکلیف خود بخود جاتی رہی تھی۔ اور خدا خدا کر کے جب اس نے اپریشن ختم کیا۔ تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اسے سرخرو رکھا اپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسسٹنٹ کو اس کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کر

اپنے ہاتھ دھوئے اور گھر چلا گیا۔

اختر اسے باہر کے دروازے میں کھڑی ہوئی ملی۔ اسے دیکھتے ہی اشتیاق سے پوچھنے لگی "اب کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب؟ کوئی سخت چوٹ تو نہیں آئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان کی زندگی خطرے میں تو نہیں۔"

شوکت مسکرا پڑا اور بولا "خدا کا شکر ہے کہ آپریشن کامیاب رہا۔ اب انشاءاللہ انھیں کل صبح تک ہوش آجائے گا۔ چوٹ تو سخت آئی تھی لیکن وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

اختر نے اس کی بات سن کر اسے ایسی تشکر آمیز نظروں سے دیکھا کہ اس کی ساری محنت وصول ہو گئی۔ اور صرف آپریشن ہی کی محنت نہیں بلکہ زندگی کی تمام محنت وصول ہو گئی۔

پھر شوکت نے پوچھا "آپ نے غسل کر لیا؟"

"جی نہیں" اس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے پھر ہلکے سے کہا۔ "اگر آپ غسل کر لیتیں تو سفر کی تکان دور ہو جاتی، اور چائے بھی نہیں پی۔"

"نہیں۔"

"آئیے چائے تو پی لیجئے، پھر ان کے کمرے میں چلی جائیے، میں ضروری ہدایات دے آیا ہوں۔ نرس اُن کے پاس بیٹھی رہے گی۔"

چائے پیتے ہوئے انھوں نے کوئی خاص بات نہ کی۔ شوکت نے بتایا کہ کم سے کم پندرہ دن میں تصدق صاحب اس قابل ہو جائیں گے کہ انھیں کہیں لے جایا جا سکے۔ پھر بھی اختر نے اس کے مشورے سے اپنے اور تصدق کے رشتہ داروں کو تار دیدئے۔

اختر کے آنے سے شوکت میں ایک نئی زندگی سی آگئی تھی۔ وہ شاداں و فرحاں پھر رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر خود بخود ایک تبسم، ایک خوشی برس رہی تھی، سارے ملازم کیا نرسیں، کیا کمپاؤنڈر اور کیا ڈاکٹر سب حیران تھے کہ آج ڈاکٹر شوکت اتنا خوش کیوں ہے۔ خود اختر حیران تھی کہ ڈاکٹر اس میں اور اس کے شوہر میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ اسے اس کی چال ڈھال میں، اس کی گفتگو میں ہائی سرجن افتخار نظر آرہا تھا۔ لیکن افتخار اب اس دنیا میں کہاں تھا۔ افتخار کا خیال آنے سے اس کا دل ایک دم پژمردہ سا ہوگیا۔ اسے اپنی بے وفائی پر افسوس ہوا۔ گو وہ اس وقت اپنے اس فعل کو بے وفائی نہ سمجھتی تھی۔ لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس کے دل میں یہ خیال بیٹھتا گیا کہ اسے اپنے وعدوں کا احترام کرنا چاہئے تھا۔ اور تصدق کے ہاتھوں اپنے آپ کو اور اپنی خودی کو بھی نہ بیچ دینا تھا۔ تصدق کے دل اور دماغ میں حکومت کرنے کی بو بہت زیادہ تھی۔ شروع شروع میں وہ تصدق کے حکومت کرنے کی اس بو سے مرعوب ہوگئی تھی۔ لیکن شادی ہونے کے کچھ عرصہ بعد اس کی خودی، اس کا دل، اس کا دماغ اور اس کے جسم کا رواں رواں تصدق کے حاکمانہ رویہ کے خلاف بغاوت بغاوت پکارنے لگا لیکن ان سب کی آواز کو وہ اپنی نسوانی کمزوری سے دباتی رہتی۔ اور پھر وہ سوچتی کہ اب اس بغاوت سے کیا فائدہ افتخار تو ہے نہیں جو میری قدر کرے گا اس کے علاوہ تصدق میں اور خوبیاں بھی تو تھیں۔ جن سے وہ محبت کرتی تھی اور بہت محبت کرتی تھی۔

رات کا کھانا ڈاکٹر شوکت نے اس کے پاس اس کے کمرے ہی میں بھیج دیا۔ پھر دس بجے تو وہ خود مسٹر تصدق کو دیکھنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں

شیشے کے ایک چھوٹے سے گلاس میں دوا کی خوراک بھی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا "مسز تصدق میں آپ کے لئے یہ دوا لایا ہوں۔ اس کے پینے سے آپ کی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔"

اختر نے شکریئے کے ساتھ دوا پی لی۔ اور ڈاکٹر تصدق کی نبض دیکھ کر واپس چلا گیا۔

بارہ بجے تو پھر ڈاکٹر ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ اختر تصدق کے پلنگ کے قریب بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ نرس شوکت کو دیکھ کر ذرا بھی متعجب نہ ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر نازک حالت کے مریضوں کو رات کے وقت کئی کئی دفعہ دیکھنے آتا ہے لیکن جب شوکت تصدق کی نبض دیکھ کر اور پھر تھرمامیٹر سے درجۂ حرارت لے کر بھی نہ گیا۔ بلکہ دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گیا تو البتہ اسے حیرت ہوئی۔ اس نے ہمت کر کے ڈاکٹر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اختر کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ نرس نے دبے الفاظ میں پوچھا "کیا مریض کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

نرس خاموش ہو گئی اور ڈاکٹر پھر اختر کے دلفریب چہرے کی طرف شوق کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ نرس نے پھر پہلے کی طرح ذرا سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے ایک دم چونک کر کہا۔ جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ "نہیں ——— کیوں؟ تمہیں جانے کا خیال کیوں آیا۔"

نرس نے کچھ جواب نہ دیا۔ نظر اٹھائی اور اختر کی طرف دیکھنے لگی۔

یہ نرس ہمیشہ ڈاکٹر شوکت سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن ڈاکٹر نے کبھی اس کی ہمت افزائی نہ کی اور اس کی شوخیوں پر کبھی اسے نکالنے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ بلکہ ہمیشہ معاف کر دیتا۔ اس دفعہ بھی اس نے اس کی بات سے کوئی زیادہ اثر نہیں لیا۔ دراصل اختر کو اپنے اتنے قریب سوتا دیکھ کر اس کے جی میں بے اختیار خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ کاش وہ اُن رخساروں کو چوم سکتا جو اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی تر و تازہ گلاب کے پھول کے مانند تھے۔ یا کم از کم اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے آہستہ آہستہ انھیں مس کر سکتا۔ نیند کے عالم میں حسن کتنا زیادہ دل کش ہو جاتا ہے! اس بات کا اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا۔ اگر نرس نہ بولتی تو نہ معلوم وہ کب تک وہاں بیٹھا اختر کو تکتا رہتا۔

ڈاکٹر نے نرس کے اشارے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو ایک ایک گھنٹے کے بعد تھرمامیٹر لگا کر دیکھتی رہنا اور ٹمپریچر تیز ہو جائے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

دوسرے دن تصدق کے اور اختر کے کئی رشتہ دار آ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے اسے ذرا دیر کے لئے ہوش آ گیا تھا۔ مگر نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد غش پڑنے لگا۔ شوکت نے رشتہ داروں کو اس کے پاس بہت کم دیر ٹھیرنے دیا۔ اور الگ لے جا کر سمجھا دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اپریشن خدا کے فضل سے کامیاب ہو گیا ہے۔ ان کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے سے ان کی طبیعت پر برا اثر پڑے گا۔ رشتہ دار ایک دن ٹھیر کر تصدق سے اس کا حال پوچھ کر چلے گئے۔ صرف اختر کی ماں رہ گئی اور ایک لڑکا۔ لیکن شوکت نے ایک دن بھی ان کے نوکر کو کھانا

نہ پکانے دیا۔ دونوں وقت اپنے یہاں سے بھجواتا رہا۔ اور چار وقت چائے بھی۔ اس پر مستزاد ایسی تن دہی سے تصدق کا علاج کیا اور ایسی خدمت کی کہ تصدق بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اختر اور اختر کی ماں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

دن گذرتے گئے اور دنوں کے ساتھ ساتھ تصدق کی صحت اور طاقت واپس آتی رہی۔ اختر بھی کمزور رہتی تھی۔ اس نے بھی ڈاکٹر سے اپنے لئے دوا تجویز کرالی تھی اور وہ بھی دوا کے استعمال سے اپنے بدن میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں ماں بیٹی اسپتال میں اور ڈاکٹر شوکت میں بہت دلچسپی لیتیں اور وہ بھی جہاں تک ممکن اور مناسب ہوتا اُن کے ساتھ وقت گذارنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

ایک دن اختر اور اس کی ماں ڈاکٹر کے یہاں بیٹھی تھیں کہ اختر کی ماں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ اکیلے کیوں رہتے ہیں۔ اتنی محنت کرنے کے بعد تو ضروری ہے کہ آپ کو گھر پورا پورا آرام ملے۔ آپ نے شادی کی ہی نہیں یا بیوی آج کل یہاں نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے جیسے مشغول آدمی کو شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔"

اختر بولی۔ "الٹی بات آپ جیسے مشغول آدمی کو تو فوراً شادی کرلینی چاہیئے۔"

اختر کی بات شوکت کے دل میں تیر بن کر لگی۔ ابھی اُس نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ اختر کی ماں بولیں "ہاں بیوی کے بغیر آدمی کو آرام نہیں مل سکتا۔"

ڈاکٹر نے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن آپ یہ تو بتائیے کہ شادی کے بعد میں خلق خدا کی خدمت کے لئے اتنا وقت کہاں سے لاؤں گا۔"

اختر فوراً بولی "شادی کے بعد تو آپ کا یہ بوجھ آدھا رہ جائے گا۔"

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "بوجھ آدھا کرنے والی بیوی ——" لیکن پھر بھی کچھ سوچ کر اس نے اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اور کچھ توقف کے بعد بولا "مسز تصدق اب تو مسٹر تصدق پانچ چھ دن میں جانے کے قابل ہو جائیں گے۔"

وہ اسے مسز تصدق کے نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے کافی سے زیادہ احتیاط کرنی پڑتی۔ گو اسے تصدق اختر نام بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کی زبان پر جب بھی آتا اختر ہی آتا اور اختر کہنے سے وہ جان بوجھ کر گریز کرتا کیونکہ اختر کہنے سے اسے پہلی باتیں یاد آجاتیں اور اور پہلی باتوں کی یاد سے اس کے دل پر چھریاں سی چلنے لگتیں۔

ہاں تو اس نے کمال چالاکی سے اپنی شادی کا ذکر بدل دیا اور ماں بیٹی کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا یا انھوں نے مصلحتاً دوبارہ ذکر نہ چھیڑا پھر وہ دونوں بھی تصدق ہی کی باتیں کرنے لگیں۔

جس روز انھیں جانا تھا اس سے ایک دن پہلے اختر نے ایسا وقت نکالا کہ ڈاکٹر شوکت سے کچھ باتیں تنہائی میں کر سکے۔ وہ دوپہر کو اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ پھر اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا کہ اختر اس کی طبیعت کا حال پوچھنے آگئی۔ شوکت اختر کو دیکھتے ہی بہ تعظیم کھڑا ہو گیا۔ لیکن پھر

فوراً ہی معافی مانگ کر لیٹ گیا۔ اختر آ کر اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا۔ شوکت نے ایک دم دوسری طرف کروٹ بدل لی اور بولا "مسز تصدق آپ کرسی پر تشریف رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

اختر اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ شوکت نے پھر بے تابی سے کروٹ بدلی اور پوچھا۔

"اب مسٹر تصدق بالکل تندرست ہیں نا؟"

"وہ تو تندرست ہیں لیکن آپ کا کیا حال ہے؟"

"میرا حال؟ اچھا ہے! شکریہ! مسز تصدق شکریہ!!"

"یہ تکلیف کیا آپ کو اکثر ہو جاتی ہے؟"

شوکت نے جلدی جلدی کئی کروٹیں بدلیں۔ اختر پھر بولی "آپ دورے کی شدت کے وقت کیا کوئی دوا نہیں پیتے۔ اگر پیتے ہیں تو مجھے بتائیے کہ کہاں رکھی ہے میں آپ کو ایک خوراک پلا دوں۔"

ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مہربانی۔ دوا تو میں پی چکا اور میری حالت سے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ذرا سی دیر میں بالکل تندرست ہو جاتا ہوں اور ذرا سی دیر میں بہت زیادہ بیمار۔"

اختر نے متاثر ہو کر کہا "یہ تو بہت برا ہے۔ آپ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"علاج؟ ——— اس کا علاج؟" اس نے ایک اور کروٹ بدلی اور بولا "مسز تصدق کیا آپ مجھے معاف کر دیں گی اگر میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ جائیے اس تکلیف میں تنہائی کی سخت

ضرورت ہوتی ہے۔"

اختر نے ہمدردی کے لہجے میں جواب دیا۔"خیر معافی کی تو اس میں کیا بات ہے لیکن اگر میں خاموش بیٹھی رہوں۔"

ڈاکٹر نے اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور خاموش لیٹا ہوا چھت کو تکتا رہا۔ اختر کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے ہیں۔ اختر بھی خاموش بیٹھی اسے تکتی رہی۔ اس کے دل میں ڈاکٹر کے لئے ہمدردی اور مہربانی کے جذبات پیدا ہوتے رہے اسے ڈاکٹر کی تنہائی اور بے کسی پر رحم آتا رہا۔ وہ سوچتی رہی کہ اتنا بڑا ڈاکٹر اور بیمار لوگوں کی بے لوث خدمت کرنے والا جب اسے خود تکلیف ہوتی ہے تو کوئی ایسی ہستی اس کے پاس نہیں ہوتی جو اس کے درد کو اپنا درد اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے یا جو اس کی دلجوئی کر سکے جس کے قرب سے اسے ڈھارس بندھے اور یہ اس طرح بے چینی سے پہلو نہ بدلے۔ اختر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ڈاکٹر کی زندگی کے اس خلا کو پورا کر سکتی، لیکن وہ تو کسی اور کی ہے، وہ ڈاکٹر کی نہیں بن سکتی اس پر تو تصدق کی ملکیت کا لیبل لگ رہا ہے، پھر اسے ہاؤس سرجن افتخار کی یاد آئی وہ دونوں مل کر ایک بہت بڑا اسپتال ہی تو کھولنا چاہتے تھے۔ ایسا اسپتال جس میں غریب سے غریب اور امیر سے امیر کا یکساں علاج، یکساں سلوک کیا جا سکے اور جس میں امیر لوگ روپے کے بدلے ڈاکٹر کو نہ خرید سکیں۔ ڈاکٹر شوکت کا اسپتال ایسا ہی تو ہے۔ اس کے کام میں مدد کر کے گویا وہ افتخار کی روح کو بھی خوش کر سکتی ہے اور خلقِ خدا کی خدمت بھی بڑے اچھے طریقے اور پیمانے پر ہو سکتی ہے۔ اُس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی

کہ وہ ڈاکٹر شوکت کے ساتھ رہنے لگے اور اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اس کے اسپتال میں عورتوں کا ایک الگ سیکشن کھول دے اور اس کی نگرانی خود کرے۔ شوکت کے اسپتال میں اگر اسے کوئی کمی نظر آتی تھی تو یہی کہ عورتوں کے لئے الگ انتظام نہ تھا۔ جیسا کہ زنانہ اسپتالوں میں عورتوں کے لئے ہوتا ہے یا جیسا کہ ہونا چاہئے۔ لیکن تصدق اسے اس بات کی اجازت ہی کب دے گا۔ وہ اسے کسی کام کے قابل ہی کب سمجھتا ہے وہ تو حکم دینا جانتا ہے۔ اختر یہ کردو۔ اختر وہ کردو۔ اختر فلاں کام اس طرح سے ہوجائے اور فلاں کام اس طرح سے اور اس کے یہ معنی ہوئے کہ تصدق کی نظروں میں اس کی حیثیت ایک خادمہ کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ ایک معاملہ میں اس نے تصدق سے سفارش کی تھی۔ اس کی ایک سہیلی کے شوہر کی ترقی کا سوال تھا، اور تصدق اسے ترقی دینا نہ چاہتا تھا تو اُس نے نہایت خشکی سے کہدیا تھا کہ اختر تم میری بیوی تو ضرور ہو۔ لیکن میرے سرکاری کاموں کی مشیر کار ہرگز نہیں۔ جو بات میں بہتر یا انصاف پر مبنی سمجھوں گا کروں گا۔ وہ شوکت کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اس کی ماں اور تصدق بھی ڈاکٹر کی مزاج پرسی کو آگئے۔ یہ انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر انھیں ساتھ لے کر بہت جلد واپس چلی گئی۔

اگلے دن جب یہ رخصت ہونے لگے تو شوکت نے بڑے تپاک اور خلوص سے انھیں کار میں بٹھایا۔ تصدق صبح سے بل کا تقاضا کر رہا تھا مگر ڈاکٹر ٹال دیتا تھا۔ آخر کسی اور طریقے سے اسپتال کی مدد کرنے کی بابت سوچ کر تصدق چپ ہوگیا تھا۔ جب کار روانہ ہوئی تو شوکت کی آنکھوں میں

بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اُسے محسوس ہوا کہ دوسرے کی چیز اس طرح دوسرے کی چیز ہوتی ہے۔ جس اختر کی آمد سے اس کے اسپتال کا چپہ چپہ حسین ہو گیا تھا۔ جس اختر کی آمد سے اُس کے دل کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا تھا۔ جس اختر کی آمد سے اس کی مسرتوں سے خالی زندگی مسرتوں سے بھرپور ہو گئی تھی اُس اختر کو ہاں اُس اختر کو تصدق "مسز تصدق" کا لیبل لگا کے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اور شوکت بے بس کھڑا یہ منظر، یہ دردناک منظر، یہ دردناک اور روح فرسا منظر دیکھ رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اسسٹنٹ ڈاکٹر سے مریضوں کے دیکھنے کے لئے کہا اور خود گھر چلا گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے یکایک اس کی آنکھوں کے ذریعہ سے اس کے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی۔ ٹانگوں میں تو خاص طور پر بالکل سکت نہ رہی تھی گھر پہنچا ہی تھا کہ نوکر نے ایک لفافہ دیا۔ اور بتایا کہ چھوٹی بیوی جی دے گئی تھیں۔ شوکت نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اندر سے ہزار روپے کا ایک چیک نکلا۔ چیک دیکھ کر وہ رو ہی تو پڑا۔ اختر نے اس کی تمام محنت، ہمدردی خدمت اور خلوص کی قیمت ایک ہزار روپے لگائی تھی اور اس کے نزدیک ان چیزوں کی قیمت روپے سے ادا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ایک ہزار کیا اگر وہ ایک لاکھ روپے کا چیک بھی دے جاتی تو بھی شوکت کو اتنا ہی رنج ہوتا اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور فوراً آرام کمرے میں چلا گیا۔ اور وہاں جاتے ہی ایک دم چارپائی پر گر پڑا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اس نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ چپ چاپ لیٹا رہا اور روتا رہا۔ آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا غم اس کی برداشت سے کتنا زیادہ ہے آنسو بہا لینے سے غم کی تیزی میں قدرتی طور پر کمی آجاتی ہے۔

شوکت بھی جب خوب رو چکا تو اسے تسکین سی محسوس ہونے لگی۔ اور دل کا بوجھ بھی ہلکا سا ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں اسی طرح لیٹا رہا۔ نہ کسی ملازم کو بلایا اور نہ خود ہی باہر گیا۔ شام ہوئی تو اٹھا اور چیک کو دوسرے لفافے میں بند کر کے مسز تصدق کے نام واپس کر دیا۔

اختر کے چلے جانے پر شوکت کا خیال تھا کہ اب وہ اسپتال نہ چلا سکے گا۔ اور نہ اُس مستعدی ہی سے کام کر سکے گا لہذا سوچا کہ سب کچھ اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر کے خود کہیں چلا جائے اور خدا کی یاد میں باقی زندگی گذار دے، اُس خدا کی یاد میں زندگی گذار دے جس نے دنیا میں اختر جیسی حسین عورت پیدا کی تھی۔ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی حالت اپنی پہلی حالت پر آتی گئی اور کچھ ہی دنوں میں وہ اپنے پہلے معمول کے مطابق کام کرنے لگا۔ جیسے اختر آئی ہی نہ تھی جیسے اختر نے اس کو دوبارہ دیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن اس بات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ایک دن اسے اختر کا تار ملا۔ لکھا تھا فوراً پہنچئے تصدق سخت بیمار ہیں۔ تار کے لفافہ پر اس کا نام ڈاکٹر افتخار شوکت لکھا تھا۔ اسے سخت حیرت ہوئی کہ اختر نے افتخار کیسے لکھ دیا۔ کیا وہ مجھے پہچان گئی تھی یا بعد میں اس نے تحقیق کرایا۔ اپنی اُس سہیلی سے معلوم کر لیا جن کے یہاں جانے پر اُس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بہر حال وہ پہلی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ مگر اس کے پہنچتے پہنچتے تصدق کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے شوکت کو اطلاع ہی اس وقت دی تھی جب وہاں کے سول سرجن اور دوسرے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے انتہائی کوشش کی کہ تصدق کی زندگی کا ٹوٹا ہوا

رشتہ پھر سے جوڑ دے۔ مگر مشیت کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔ دو دن
رات یہ اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھا تعجب اور افسوس کرتا رہا کہ دوائیں
الٹا اثر کیوں کر رہی ہیں۔ آخر جو ہونا تھا۔ وہ ہو کر رہا۔ تصدق چل بسا
اور اختر کو ڈاکٹر شوکت کے اسپتال میں اپنے حسبِ منشاء عورتوں کا
سیکشن کھولنے کے لئے آزاد چھوڑ گیا۔

۱۷- اگست ۱۹۴۳ء

آج میں بازار سے گذر رہا تھا کہ مس ناز نظر آئی۔ اتفاقیہ اور مدت کے بعد وہ کار سے اتری۔ ایک مرد اس کے ساتھ تھا۔ اور ایک انگریز عورت، میرے قریب سے ایک شانِ استغنا کے ساتھ گذر گئی۔ ایک دم میرے دل میں خیال آیا کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں،، اور دوسرے لمحے میں خود دکان میں کوئی چیز خریدنے کے بہانے جانے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اتنے میں وہ لوگ نکلے اور تیزی سے میرے نزدیک سے گذر گئے۔ میں دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب اس شبہ کی گنجائش تو نہ رہی تھی کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا —— میں سوچنے لگا کہ یہ کار یہیں آکر کیوں ٹھیری۔ اگر یہ لوگ کسی اور دکان سے جو کچھ انہیں لینا تھا لے لیتے تو ان پر میری نظر بھی نہ پڑتی اور پھر میرا صبر و سکون یوں خاک میں نہ مل جاتا۔ لیکن کار وہیں آکر ٹھیری جہاں میں اتفاق سے دو چار لمحوں کے لئے رک گیا تھا۔ بعض دفعہ واقعات اس طرح کیوں پیش آتے ہیں جیسا کہ ان کے پیش آنے سے کوئی خاص

مقصد ہو۔ جانے قدرت کو کیا منظور ہے! ابھی کل رات ہی میں دعا مانگ
رہا تھا کہ اے خدا ناز کو دیکھے مدتیں گزر گئیں۔ صرف دو لمحوں کے لئے اس
کی صورت دکھا دے۔ اور آج میرے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی
کہ وہ اس طرح نظر آجائے گی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ دہلی سے کالے
کوسوں دور ہے۔ لیکن وہ تو دو لمحوں کے لئے اپنا جلوہ دکھا کر چلتی بنی
اور میری یہ حالت ہوگئی کہ دو قدم بھی چلنا دوبھر ہوگیا ——!

ایک اسی وقت پر کیا منحصر ہے۔ میری حالت جب سے اب تک سنبھلی
ہی نہیں۔ اب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب میں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا
ہوں تو سارا سارا دن دل دھڑکتا رہتا ہے اور ٹانگوں میں سکت سی
نہیں رہتی۔ ایسا محسوس ہوتا رہتا ہے کہ قوت برداشت سے زیادہ پی
گیا ہوں۔ حالانکہ تشنگی اور زیادہ بھڑک جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ
یہ مے جو میں آنکھوں سے پیتا ہوں۔ بس پیتا ہی رہوں۔ یہاں تک کہ پیتے
پیتے میرا آخری وقت قریب آجائے اور میں ایسے سکون میں جان دیدوں
کہ موت کے فرشتے کو بھی تعجب ہو۔

———

۱۰۔ اگست ۱۹۴۳ء

آج میں نے اورنگ زیب روڈ کے کئی چکر کاٹے لیکن کچھ حاصل
نہ ہوا۔ اس خاص کوٹھی کے بالکل قریب ہی ایک چکر ہے جس پر سبز گھاس
اُگی ہے اور پھولوں والے پودے لگے ہیں۔ نئی دہلی میں جگہ جگہ چوراہوں پر

یہ چکر آتے ہیں۔ ان چکروں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ٹریفک کے حادثے
نہیں ہوتے اور پولیس مین کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ اس چکر میں بہت
دیر تک ایک بڑے سے بڑے پودے کے پیچھے چھپا بیٹھا رہا۔ مگر نہ کسی
کی جھلک نظر آنا تھی نہ آئی۔ اس چکر میں بیٹھ کر مجھے اپنی قسمت کے چکر کا
خیال آیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ انسان کی زندگی میں یہ چکر کیوں آتے ہیں
یہ چکر جو بعض دفعہ سخت خوفناک طوفانوں اور زلزلوں سے بھی زیادہ
تباہ کن ثابت ہوتے ہیں ـــــ لیکن پھر خیال آیا کہ اپنی زندگی میں تکلیف
مصیبت، تباہی یا چکر لانے کا ذمہ دار زیادہ تر آدمی خود ہوتا ہے۔

اورنگ زیب روڈ کا پتہ میں نے دکاندار سے معلوم کیا تھا۔ وہ
کتنی آسانی سے میرے فریب میں آ گیا۔ میں اطمینان سے اس کی دکان
میں گیا اور اپنا انڈی پنڈنٹ قلم دکھا کر کہنے لگا کہ کل شام کو جو ایک ہندستانی
لڑکی، گہری نیلی ساڑی والی، ایک ہندوستانی مرد اور ایک انگریز عورت
کے ساتھ چند منٹوں کے لئے آپ کے یہاں آئی تھی۔ ان میں سے کسی کا
قلم گر گیا ہے۔ اگر آپ کو ان کا پتہ معلوم ہو تو بتا دیجئے تاکہ میں انھیں اُن کا
یہ قلم دے آؤں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کچھ سوچ کر پتہ بتا دیا۔

یہ محبت بھی کیسی عجیب بیماری ہے۔ آدمی ایک شکایت کا علاج کرتا ہے
کہ دوسری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری کا مداوا کرتا ہے کہ تیسری شروع
ہو جاتی ہے۔ غرضکہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور لطف یہ کہ ایک شکایت
دوسری سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ابھی دو تین دن ہوئے
کہ میں اسے دیکھنے کی دعا مانگ رہا تھا۔ وہ نظر آئی تو دل اور زیادہ تڑپنے لگا
آخر ایک بار اور دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پتہ معلوم کیا چکر میں پھر دل

بیٹھا ہا۔ کتنی ذلیل حرکت کی۔ وقت بھی ضائع کیا۔ اور سب بے سود —
یہ خودداری نے گوارا نہ کیا کہ کوٹھی میں جا کر ملنے کی خواہش کا اظہار کروں
اور خودداری کو بھی کیوں الزام دوں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ ملاقات
کرنے سے انکار نہ کر دے۔ شاید میں خود کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا
ہوں کہ وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے۔

لیکن آدمی محبت کرتا ہی کیوں ہے؟ آخر کیا یہ بھی زندگی کی کوئی
بہت اہم ضرورت ہے؟ کہ اس کے بغیر زندگی کٹ ہی نہ سکے۔ یہ فراق
گورکھپوری کو کیا جنون ہوا تھا کہ اس نے کہا ؎

روگ پیدا کر لے کوئی زندگی کے واسطے
صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں

یہ روگ پیدا کر کے تو آدمی نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ پھر ایسے روگ سے
حاصل؟ اور ظاہر ہے کہ ایسی مصیبت سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن
محبت کا درد ایسا خوشگوار کیوں ہوتا ہے کہ آدمی تکلیف میں بھی فرحت محسوس کرتا ہے؟

———

۱۸۔ اگست ۱۹۴۳ء

پھر کئی دن گذر گئے اور ان کے جلوے کی ایک جھلک بھی نظر نہ آسکی
اور تو اور یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ چند دن کے لئے دہلی آئی تھیں یا زیادہ
عرصے کے لئے کالج سے فارغ التحصیل ہو کر تو وہ کئی مہینے ہوئے وہاں سے
چلی گئی تھیں۔ دکاندار سے صرف اپنا پتہ چلا تھا کہ وہ کچھ چیزوں کی فہرست اور
اپنا پتہ دے گئی تھیں کہ یہ چیزیں کوٹھی بھیج کر قیمت منگالیں ————!

آج صبح سے میرے دماغ میں خوفناک قسم کے خیالات چکر لگا رہے ہیں میں نے خوفناک کہا ہے۔ ہاں میں انھیں خوفناک ہی سمجھتا ہوں! آفتاب سچ کہا کرتا تھا کہ عشق اور محبت سب بیکار چیزیں ہیں۔ بس مطلب سے مطلب رکھو۔ اگر مطلب نکلنے کی امید ہے تو ہاتھ پاؤں مارو ورنہ کوئی اور مقام تلاش کرو۔ میں جواب دیتا کہ تمہاری روح نے ابھی پاک محبت کی بالیدگی کا مزا نہیں چکھا۔ اور وہ قہقہہ لگا کر کہتا کہ اگر روح کی بالیدگی۔ تکلیفیں اٹھانے کا نام ہے تو مجھے ایسی بالیدگی نہیں چاہیے۔ یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ تو آج میں سوچ رہا ہوں کہ وہ سچ کہا کرتا تھا۔ یہ پاک محبت، یہ سچی محبت سب بکواس ہے۔ اصل میں جہاں آدمی کو اپنا مطلب پورا ہونے کی امید نہیں ہوتی۔ وہاں وہ سچی اور بے لوث محبت کا ڈھکوسلہ لگا لیتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ تو یہ بات نہ تھی —— پھر بھی آخر سچی محبت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو جائے۔ تو شادی! وہی مطلب برآری، خواہ مذہب کی آڑ لے کر کی جائے خواہ گناہ کی!

اس نے مجھے کتنے موقعے دیئے۔ رات کی تنہائیوں میں ملی۔ جذبات انگیز باتیں کیں۔ موسم، ہوا، چاندنی، پھول، دریا کن کن چیزوں کا حوالہ دیا اور کس کس انداز میں۔ تاج محل میں تو گویا وہ بالکل ہی ہوش میں نہ رہی تھی لیکن وہ سماں ہی ایسا تھا۔ اکتوبر کی چاندنی رات، تنہائی اور تاج محل کون ہے جو ایسے میں اپنے جذبات پر قابو رکھ سکے۔ لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یہی سمجھے رہا کہ اپنی انگلی تک اس کے جسم سے لگانی گناہ ہے اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ وہ دوسرے جوانوں سے ملنے لگی۔ میں نے اسے متنبہ کیا کہ یہ لوگ بدنام ہیں۔ ان سے میل جول رکھنا رسوائی کا باعث ہوگا۔

مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ پھر میں نے اور زیادہ سختی سے کہا تو جواب ملا کہ آدمی اگر خود درست ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں خاموش ہو گیا۔ جتنا کچھ سمجھا سکتا تھا سمجھا چکا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا یا سمجھانا میرے بس سے باہر تھا۔ مجھ سے تعلقات کم ہوتے رہے اور ان سے بڑھتے رہے حتیٰ کہ معمول میں بھی کمی آگئی۔ ہفتہ میں دو دن جو ہم نے ملاقات کے مقرر کر رکھے تھے ان میں بھی ناغہ ہونے لگا۔ پھر یہ ہوا کہ ہفتے گزر جاتے اور اس سے بات تک کرنی نصیب نہ ہوتی۔ کبھی ٹیلیفون پہ بلاتا تو بھی روکھے پن سے پیش آتی۔

آخر ایک رستہ سمجھ میں آیا۔ پرنسپل صاحب سے مل کر اس پر پابندیاں عائد کرا دیں۔ مگر جب انسان کسی سے ملنا چاہے تو ہزار پابندیاں عائد کرا دیجئے وہ ملے گا اور ضرور ملے گا۔ پھر میں نے فرضی نام سے اس کے والدین کو خط لکھے اور پرنسپل سے بھی لکھوائے والدین نے اسے ڈانٹا۔ کچھ دن ان سے دبی رہی۔ مگر ایک مرتبہ ماں کے سخت سست خط پر لکھ بھیجا کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ زندگی کے اونچ نیچ سب سمجھتی ہوں اگر آپ لوگ مجھے زیادہ تنگ کریں گے تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گی، ماں ڈر گئیں۔ انھوں نے وہ خط پرنسپل صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اور لکھ دیا کہ خدا کے لئے زیادہ سختیاں نہ کیجئے مبادا وہ سچ مچ کچھ کھا لے۔ چلئے قصہ پاک ہوا۔

ہاں، تو آج مجھے آفتاب کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ کمبخت کتنا سچا تھا۔ کہتا تھا کہ احسن میری بات مان لے ورنہ پچھتائے گا آخر یہ سوچ کر کہ وہ تجھ سے کیوں ملتی ہے۔ میں نے کہا محبت کی وجہ سے کہنے لگا بالکل بکواس ہے۔ محبت کرنے کو تو ہی حسین جو رہ گیا ہے۔ یہ بات ذہن میں

رکھو کہ وہ جوان ہے اور کالج میں پڑھتی ہے۔ اور پھر ایسے کالج میں جو بہت بدنام ہے پھر اس نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ بہت جلد اپنا رویہ بدل لے گی۔ اور اس کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔
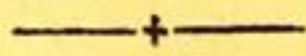
۲۵۔ اگست ۱۹۴۳ء

کئی دن سے میرے جذبات میں جنگ ہو رہی ہے۔ آفتاب کی باتوں نے یاد آ کر گویا دل میں آگ سی لگا دی۔ میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ آیا مس ناز واقعی اس درجہ گر گئی تھی کہ ان بدمعاشوں کے فریب میں آ گئی۔ اگر نہیں تو اس نے مجھ سے تعلقات کم کیوں کر لئے تھے کہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسا کہ اس سے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔ سوچ سوچ کر میرے دل نے آج یہی فیصلہ کیا کہ مس ناز اتنی نہیں گر سکتی جتنا کہ آفتاب اس کے متعلق حاشیہ آرائی کیا کرتا تھا۔ اس فیصلہ کے بعد میرے دل میں اس کے لئے پھر وہی عزت و محبت پیدا ہو گئی جو کبھی پہلے تھی۔ اس کے لئے میری محبت اور عزت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ لیکن اب بھی میرے دل کے ایک گوشے سے جس پر عقل کا تسلط زیادہ ہے یہی صدا آتی ہے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ محبت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ محبوب کے ہر برے فعل کو بھی نیک تصور کرتا ہے۔ شاید یہ صدا سچ ہو۔ بہر حال یہ تو ماننے میں مجھے ذرا بھی باک نہیں کہ میں نے محبت میں اپنی زندگی کے سات قیمتی سال ضائع کر دیئے۔ آہ! اگر میں اس طویل مدت میں اپنے پروگرام کے مطابق عمل

کرتا تو آج کامیابی اور عیش و عشرت میرے پاؤں چومتے۔ مگر میں اپنا پروگرام بھول گیا۔ میں اپنی زندگی کا مقصد بھول گیا۔ میں سب کچھ بھول گیا محبت میں انسان سب کچھ کیوں بھول جاتا ہے۔ محبّت، محبّت، محبت ——— جہاں سنتا ہوں محبت ——— آخر محبت کیا ہے، دیوانگی اور جنون؟ لیکن اگر دیوانگی اور جنون ہے تو لوگ محبّت کیون کرتے ہیں؟ لوگ محبت کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کیوں کر دیتے ہیں؟ لیکن یہ کام کمزور دل انسانوں کا ہے۔ جن کے دل سخت ہوتے ہیں۔ وہ محبت نہیں کرتے۔ اگر کرتے ہیں تو زبان سے نہیں کہتے۔ اور پھر جذبات کی رو میں نہیں بہہ جاتے۔ وہ محبت کے لئے اپنے دوسرے اہم کام پس پشت نہیں ڈال دیتے اور وہی لوگ ترقی بھی کرتے ہیں۔

آفتاب کا نظریہ ماننا پڑے گا۔ لیکن اب زندگی کے سات بہترین سال ضائع کر کے اس کا نظریہ ماننا بھی تو کس کام کا۔

۳۰۔ اگست ۱۹۴۳ء

آج قریشی کا خط ملا۔ یہ میرا اور آفتاب کا برابر کا دوست ہے۔ یہ بیچارہ بھی میری طرح پاک محبت کا حامی تھا۔ مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اب محبت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ مگر یہ تہذیب نو کی پروردہ حسین تتلیاں دوسروں کے لئے غارتگری کا سامان مہیا کرنے میں کتنی تیز ہیں اور پھر دوسرے کو یہ یاد کر کے ایسے الگ ہو جاتی ہیں جیسے ان کے

علم میں کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ کسی کی تو جان پر بن جاتی ہے اور ان کے لئے یہ ایک معمولی سا واقعہ ہوتا ہے —— جو یاد رکھنے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔

قریشی لکھتا ہے کہ میں تھک چکا ہوں۔ دوستی مرد سے ہو یا عورت سے نتیجہ ایک ہی ہے ع دوست بنتے جائیے دشمن بناتے جائیے۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں محبت سے تائب ہو چکا ہوں تو مجھے یہ حسین حادثات کیوں پیش آتے ہیں۔

غریب بیمار تھا۔ سری نگر گیا تھا کہ وہاں صحت نصیب ہو جائے گی۔ لیکن بیماری کیوں پیچھے رہ جاتی۔ وہ بھی ساتھ ہی گئی۔

ہاں! تو وہ لکھتا ہے —— "ابھی پرسوں کا واقعہ ہے۔ ہماری کوٹھی ایک پختہ سڑک کے کنارے پر ہے۔ میں کوٹھی سے نکل کر تنہا کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر گاف اسٹک کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں پورے انہماک کے ساتھ اس رنگین پہاڑ کو تک رہا تھا۔ جو بہت تیزی کے ساتھ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ کم از کم ایک فرلانگ تک اس جگہ سے کوئی مکان یا کوٹھی نہیں تھی۔ میں تقریباً پندرہ منٹ تک بالکل ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر اچانک جب میں نے اپنے بائیں طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر ایک لڑکی، مہذب، تعلیم یافتہ ایک بلی کے بچے کو بغل میں دبائے چلی آرہی ہے! اور اس سے باتیں بھی کر رہی ہے۔ اسے دیکھ کر میری سانس کی رفتار میں کچھ غیر معمولی برہمی سی پیدا ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنی نگاہیں پھر کوہ و فلک کے ارتباطی خط پر جما دیں اور کوشش کی کہ اس کی اس بے باکانہ آمد کا کوئی اثر قبول نہ کروں۔

لیکن وہ نہایت خراماں خراماں بلّی سے باتیں کرتی ہوئی۔ اسے چومتی چاٹتی ہوئی پانچ گز کے فاصلے کو دس منٹ میں طے کر کے مجھ تک پہنچ ہی گئی سڑک کی چوڑائی تقریباً بارہ فٹ ہے۔ میں سڑک کے مغربی کنارے پر مغرب کی طرف منہ کئے کھڑا تھا ـــــ وہ مشرقی کنارے پر مغرب کی جانب منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ میرے اور اس کے درمیان اگر ایک خط کھینچا جاتا تو تقریباً دو گز لمبا خطِ مستقیم بن جاتا۔ وہ اپنی بلّی کو مخاطب کر کے یونہی بولتی رہی۔ بہت سے فقرے ذہن میں نہیں رہے۔ چند یہ ہیں۔ "جُمّی! دیکھ کتنا اچھا وقت ہے۔ وہ دیکھ پہاڑ کے سنہری کنارے کتنے خوبصورت ہیں۔ آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ اچھا تو اب تھک گئی ہے۔ گھر واپس جائے گی اچھا چلو، چلتے ہیں۔ لیکن نہیں، ابھی نہیں جُمّی! گھر میں تو آج کوئی بھی نہیں۔ وہاں اکیلی کیا کرے گی؟"

میں نے اس کی باتوں میں دخل دینا چاہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں جرأت نہ ہوئی۔ دو ایک مرتبہ مڑ کر اس کی طرف ضرور دیکھا۔ لیکن تابِ گویائی نہ لا سکا۔ آخر کافی دیر کے بعد وہ چلنے پر آمادہ ہو ہی گئی اور قدموں کو جنبش بھی دے دی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور بغیر سوچے سمجھے بولا۔

"آپ جا رہی ہیں؟"

"ہاں ہم جا رہے ہیں تمہیں کیا؟" اُس نے کہا۔

"اچھا آپ ہم ہیں اور ہم ـــــ تم۔"

"ہم ہم ہی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر جناب ہم بھی ہم ہی ہیں۔"

وہ بولی "ہوا کرے ـــ ہمیں کیا؟"

میں نے کہا۔ "آپ بھی ہوں گی ہمیں کیا؟"

پھر اس نے تنک کر پوچھا۔ "بات آپ نے شروع کی یا ہم نے؟"

اور میں نے کہا۔ "دیکھئے اب آپ نے مہذبانہ گفتگو شروع کی ہے اور مجھے آپ سے مخاطب کیا ہے تو میں بھی نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ گفتگو کا ماحول آپ نے پیدا کیا یا میں نے؟"

کہنے لگی۔ "آپ نے۔"

میں نے حیران ہو کر دریافت کیا "وہ کیسے؟"

اپنی ہنسی کو چھپاتے ہوئے بولی۔ "آپ یہاں آکر کھڑے کیوں ہوئے؟"

میں نے جواب دیا۔ "یہ میری غلطی ہے۔ میں نووارد ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کشمیر میں غالب کا یہ مصرعہ۔ "بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں"۔ خلافِ قانون ہے۔ یہاں رہگذر پر کھڑے ہونے کا حق صرف لڑکیوں کو ہے۔ مردوں کو نہیں۔"

"آپ سے جیتنا مشکل ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا "اب ہم جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جاتے جاتے اپنا نام تو بتاتی جایئے۔"

"کیوں ـــ کیا ہو گا نام سے۔" اس نے دریافت کیا۔

"تمام زندگی کا راز نام ہی میں تو مضمر ہے۔"

اس نے طنزاً کہا۔ "مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ سے باتیں کرتے کرتے میرا سر چکرا گیا۔ اب مجھے جانے دیجئے۔"

قریشی لکھتا ہے کہ وہ چلی گئی اور اس کے بعد نظر ہی نہیں آئی۔ میرے خیال میں قریشی نے سخت غلطی کی جو ماحول سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور اسے

یونہی جانے دیا۔ اگر جانے بھی دیا تھا تو خود بھی ساتھ ہی چلا جاتا۔ بلی سے باتیں کرتے ہوئے۔ وہ بتا چکی تھی کہ گھر میں آج کوئی بھی نہیں۔ لیکن یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ خط آج سے تین چار ہفتے پہلے آیا ہوتا تو بھی کیا۔ میں یہی سوچتا۔ میرے خیالات اتنی تیزی سے کیوں بدل رہے ہیں۔ لڑکی کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ آگ لگا بی جمالو الگ کھڑی۔

قریشی نے ناز کے متعلق پوچھا ہے۔ یہ میری محبت کی کہانی سن کر یا پڑھ کر کتنا خوش ہوتا تھا —— اب اسے رنجیدہ واقعات کیا لکھوں۔

—+—
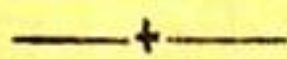
۴۔ ستمبر ۱۹۴۳ء

گذشتہ رات سے سوچ رہا ہوں کہ اگر کہیں حضرت کیوپڈ مل جائیں تو ان کا گلا ہی دبوچ لوں۔ جب تک یہ دنیا میں موجود ہیں ہزاروں نہیں لاکھوں نوجوانوں کی زندگیاں تباہ ہوتی رہیں گی۔ آہ یہ نوجوان اگر دوسرے کاموں میں لگیں تو کیسے کامیاب ہوں اور سوسائٹی کے کتنے کام آئیں۔ مگر محبت کی الجھنوں نے ان کے دماغ ماؤف کر دیئے ہیں، اور ان کے ذہن معطل۔ اب انھیں نہ سوسائٹی سے غرض ہے نہ سوسائٹی کے کسی مفاد سے اور ہوش ہو تو غرض بھی ہو۔ جب ہوش ہی نہیں تو غرض کیسی؟ اگر کیوپڈ کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا تو کیا حسن بھی ملیامیٹ نہیں ہو سکتا۔ مگر حسن کی پہچان کون کرے گا۔ یہ کسے معلوم ہے کہ کیوپڈ کسے پسند کریں۔ کچھ بھی ہو۔ کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہئے کہ جس سے نوجوانوں کو

اس مصیبت سے نکال کر قوم اور سوسائٹی کے فائدے کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ حسین ــــ حسین اور آفت کی پرکالہ عورتیں قوم کی ملکیت ہوا کریں۔ یہ کیا کہ ایک مرد قبضہ کر کے بیٹھ جائے اور بیسیوں تڑپتے پھریں۔ یا پھر بہت سخت قسم کے پردے میں رکھی جائیں کہ ان پر دوسرے مردوں کی نظر ہی نہ پڑ سکے۔

جانے آج کل میرے دماغ میں وحشی قسم کے خیالات کیوں آرہے ہیں؟ میں جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میری محبت سچی اور بے لوث ہے۔ اب مس ناز کے نہ ملنے پر یا اس کے التفات نہ کرنے پر اتنا بے قرار کیوں ہوا جاتا ہوں۔ آخر میرے دل میں اس کا قرب حاصل کرنے کی خواہش کیوں زور پکڑ رہی ہے۔ وہ نہیں ملتی تو نہ ملے۔ میری محبت میں فرق کیوں آئے کیا میں اس سے ملے بغیر محبت نہیں کر سکتا۔ کیا پاک محبت کرنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ محبوب سے ملاقات ہوتی رہے میرے لئے دونوں صورتیں یکساں ہونی چاہئیں۔ جب وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی۔ جبھی مجھے کیا حاصل ہو جاتا تھا۔ کہ اب اس سے دور رہنے پر میں اس سے لڑ پڑوں۔

خدا خیر کرے میرا ایمان تنزلزل ہو رہا ہے۔ سچی محبت میرا ایمان ہی ہے میں اپنے دل کے گوشے گوشے کو ٹٹول رہا ہوں کہ شاید کہیں سے سچی محبت کا شائبہ مل جائے۔ ایسی محبت جس میں خود غرضی کو ذرا بھی دخل نہ ہو اور میرے نزدیک یہ میری بہت بڑی شکست ہے۔ میرے سارے دعوے باطل ہو رہے ہیں جو میرے لئے سخت روحانی اذیت کا سبب بن رہے ہیں۔ سو ہیں ایک سو ایک مرتبہ آدمی کی محبت میں غرض شامل

ہوتی ہے۔ سچی اور بے لوث محبت صرف خدا کی ذات سے کی جا سکتی ہے کسی انسان سے نہیں کی جا سکتی۔

دل تو اب بھی یہی کہتا ہے کہ میری محبت پاک اور بے غرض ہے لیکن جب عقل پوچھتی ہے کہ اگر محبت بے غرض ہے تو اس کا قرب حاصل کرنے کی خواہش کیوں کرتا ہے۔ اور یہ کیوں چاہتا ہے کہ وہ اور کسی سے نہ ملے۔ اس میں تیرا کیا ہرج ہے جس سے اس کا جی چاہے ملے تو اپنی بے غرض محبت کئے جا تو دل بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔

---

۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء

آفتاب تین دن کے لئے دہلی آیا تھا۔ میرے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کر گیا۔ پوچھنے لگا مس ناز کا کیا حال ہے۔ مجھے اس سے اپنے تعلقات کی کیفیت چھپانی پڑی۔ ورنہ شرم اٹھانی پڑتی۔ میں نے کہا وہی کیفیت ہے۔ کہنے لگا ــــ "احسن! میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔ ورنہ وقت گذرنے پر کچھ حاصل نہ ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ "آفتاب! وہ لڑکی ہی ایسی ہے کہ اس سے مل کر آدمی اپنے ارادے اور مطلب سب بھول جاتا ہے۔" کہنے لگا "تم مجھے اس کے ساتھ ایک مرتبہ چائے پلا دو۔ پھر تمہارے ڈھنگ پر نہ لے آؤں تو میرا ذمہ!

آفتاب ہے تو بہت کائیاں! مگر اس معاملہ میں قابل اعتماد نہیں محبت کیسی بری چیز ہے اس میں آدمی خود سے بھی بدگمان ہو جاتا ہے

دوسرے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن اب تو اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب میرے اور مس ناز کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ جس کا پاٹنا بظاہر بالکل ناممکن نظر آتا ہے۔ لہذا چائے کی دعوت بھیجی ہی نہیں جا سکتی تھی۔

وہ تو چلا گیا لیکن مجھے اور زیادہ پریشانیوں میں مبتلا کر گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب میں اس محبت سے تنگ آ گیا ہوں۔ واقعی اگر میں اپنی محبت کو شروع سے آفتاب کی محبت کا رنگ دیتا تو اتنی زیادہ پریشانیوں سے دو چار نہ ہونا پڑتا۔ لیکن یہ محبت تھی ہی کیا۔ پھر اس نے دوستی کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ کھلے الفاظ میں اپنی محبت کا اعتراف کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اس نے میری محبت قبول ہی کیوں کی تھی؟ کیا یہ سب کچھ دھوکا تھا؟ لیکن یہ دھوکا دینے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ آخر کوئی دھوکا دیتا ہے تو اپنا کوئی مطلب پورا کرنے کے لئے۔ اُسے تو مجھ سے کوئی مطلب نہ تھا آفتاب —— نہیں نہیں، آفتاب بکتا ہے۔ لیکن وہ پھر مجھ سے علیحدہ کیوں ہو گئی۔ اس نے اپنے وعدوں کو کیوں نہ نبھایا۔ وہ ایسے لوگوں سے کیوں ملنے لگی جن کے متعلق اچھی باتیں مشہور نہ تھیں۔ پھر اس نے ایک ایسے ہی آدمی سے شادی کا وعدہ بھی کر لیا۔ ایک دوست کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ وہ مجھ سے مشورہ کرتی۔ مگر اس نے ذکر تک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے پتہ کب چلا جب میں پچھلی عید کو اس سے ملنے گیا میں نے دیکھا کالج کے ملاقاتی کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے باتیں کر رہی ہے مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ آئیے احسن صاحب، عید مبارک! آئیے میرے منگیتر سے ملئے۔ ان الفاظ میں جانے کیا تھا کہ مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ بڑی مشکل سے سنبھلا...... لیکن اب ان باتوں کے

یاد کرنے سے حاصل؟ سانپ گذر چکا ہے۔ اب میں لکیر کیوں پیٹے جا رہا ہوں۔ وہ جو کچھ تھی —— تھی! اس نے وفا نہیں کی —— نہیں کی! اب میں کیوں اپنا خون جلاتا ہوں۔ آہ! دنیا میں انسان جسے بھولنا چاہتا ہے۔ اگر اسے بھولنے میں کامیاب ہو جایا کرتا تو دنیا اتنی بری جگہ کیوں ہوتی؟ قریشی کا آج پھر خط آیا ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب پہلے شادی کرے گا بعد میں محبت —— خدا اسے کامیاب کرے اور خوش رکھے،

۳۰۔ ستمبر ۱۹۴۳ء

آدمی کی زندگی کا بھی کیا بھروسہ؟ ابھی چند دن ہوئے میں اچھا خاصا تندرست تھا۔ پھر ایک دن طبیعت معمولی سی خراب ہو گئی۔ اور دو ہی دن میں ایسی بگڑ گئی کہ حکیم صاحب جواب دے گئے۔ سب کو تو رونے کی پڑی۔ اور مجھے یہ خیال آیا کہ جاتے جاتے مس ناز کے درشن ہی کرتے چلو۔ تھوڑا سا ہوش باقی تھا۔ لہذا میں نے قلم کاغذ مانگا۔ تیمار دار سمجھے کہ وصیت کر رہا ہے۔ کاغذ کے پرزے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا —— "سخت بیمار ہوں۔ بلکہ آخری وقت ہے۔ اگر اس وقت چند لمحوں کے لئے آجاؤ تو شاید ——" اس وقت تو وہ کوٹھی پر موجود نہ تھی۔ لے جانے والا پرچہ چھوڑ آیا تھا۔ اگلے روز جب مجھے ہوش آیا تو میں نے پہلا سوال یہی کیا کہ مس ناز آئی تھی۔ ایک صاحب نے جواب دیا۔ "ہاں آئی تھی۔ کئی گھنٹے بیٹھی دل بُرا کرتی رہی ——" یہ الفاظ سن کر مجھے

ایسی تسکین ہوئی کہ مرض آدھا رہ گیا۔ شبہ تک بھی نہ ہوا کہ یہ حضرت مصلحتاً ایسا فرما رہے ہیں۔ دو تین دن کے بعد اصل بات معلوم ہوئی کہ وہ نہیں آئی تھی۔

میں نے زیادہ تکلیف میں آفتاب کو بمبئی تار دلا دیا تھا۔ آج وہ بھی پہنچ گیا۔ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے اچھی حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے سے افسردگی دور ہوئی۔ تنہائی میں میں نے اس سے کہا کہ اب مجھ سے جیا نہیں جاتا۔ اگر مس ناز میرے آخری وقت میں بھی آنے کی روادار نہیں تو اس زندگی سے کیا فائدہ؟ کہنے لگا۔ "احسن! تجھے کیا ہو گیا۔ یہ مایوسی کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ بھاڑ میں جائے ناز اور اوپر سے تمہارا عشق۔ لیکن تم سلامت رہو۔"

میں نے کہا۔ "جب میرا عشق اور میرا محبوب ہی بھاڑ میں چلے گئے تو میں تو ان سے پہلے چلا گیا۔"

میری اس بات سے اسے اور زیادہ تکلیف پہنچی۔ بولا۔ "احسن! تمہاری محبت اور جنون دیکھ کر میرا دل روتا ہے۔ اگر میرے خط لکھ کر بلانے پر کوئی مجھے دیکھنے نہ آتا۔ تو میں کبھی اس کی صورت پر بھی نہ تھوکتا۔"

"میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"ایسا دل سینے میں سے نکال کر باہر پھینک دو۔ تمہاری خودداری کو کیا ہوا۔ اگر عشق خوددار نہیں تو لعنت ہے۔"

"لعنت ہی سہی۔ لیکن یہ سوچو کہ تمہارا دوست اس لعنت میں گرفتار ہے۔ کیا تم اسے نکالنے کی کوشش نہ کرو گے؟"

"کروں گا۔ اور میں نے بہت کی ——— لیکن تمہاری باتیں اور تمہارے کرتوت دیکھ کر تو یہی جی میں آتا ہے کہ تمہیں تمہارے حال اور

ناز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور کبھی اس طرف کا رخ نہ کیا جائے۔"

پھر درد سے بولا "جو کچھ میں نے تمہیں سمجھایا۔ تم نہ صرف اسے نہ مانے بلکہ مجھ سے اپنے دل کی باتیں بھی چھپانا شروع کر دیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو آفتاب؟"

"جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تو تم نے بتایا تھا کہ مس ناز کا وہی حال ہے۔"

پھر ہم میں یہ طے پایا کہ آفتاب جائے اور جا کر بڑے درد اور مبالغہ سے اسے میری بیماری کا حال بتائے اور ایک بار دیکھنے کے لئے لے آئے"

مجھے یقین تھا کہ آفتاب اسے ضرور لے آئے گا۔ کیونکہ باتوں میں شاعری کرنے کا اسے خوب ملکہ حاصل ہے۔ اور عورت ہوتی ہی ہے فطرتاً خوشامد پسند اور نرم دل۔ لیکن آفتاب اکیلا آگیا اور کہنے لگا۔ تمہاری اور اس کی خیریت ہی اس میں تھی جو وہ یہاں نہیں ہے۔ ورنہ آج میں نے بہت خطرناک منصوبے باندھے تھے۔ اس نے بتایا کہ جب اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر احسن نام لکھ کر بھیجا تو اسے ایک گول کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک عورت برقعہ اوڑھے ہوئے آئی۔ اور آکر کہنے لگی۔ "ناز پچھلے ہفتہ سے کلکتہ گئی ہوئی ہیں جب احسن صاحب کا پرچہ آیا تو اس روز وہ کلکتہ جا رہی تھیں۔ اس لئے انھیں دیکھنے نہ آسکیں۔ جس کا انھیں بہت افسوس تھا خط لکھنے کو کہہ رہی تھیں شاید نہ لکھ سکی ہوں ذرا یہ تو بتائیے اب احسن صاحب کا کیا حال ہے؟"

آفتاب کو اس کی باتوں سے سخت حیرت ہوئی کہنے لگا۔ "میں آپ کے سامنے تو بیٹھا ہوں۔"

ہنس کر بولیں "خیر آپ احسن تو نہیں ہیں۔ میں انھیں جانتی ہوں میں نے انھیں ناز کے ساتھ دیکھا ہے۔"

مجھے بھی سخت تعجب ہوا کہ وہ کون تھی اور ناز کو کلکتہ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ پھر اگر وہ عورت ناز کی سہیلی تھی تو برقعہ اوڑھ کر آفتاب کے سامنے کیوں آئی۔ میں ناز کی کسی ایسی سہیلی کو نہیں جانتا جو برقعہ استعمال کرتی ہو —— جس کے پاس وہ آکر ٹھیری تھی۔ وہ تو ناز کی طرح بالکل بے پردہ تھی۔
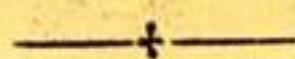
۲۰۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

آفتاب مجھے سمجھا بجھا کر پھر لاہور چلا گیا تھا ——!

بیماری کے دوران میں چونکہ آدمی کے دماغ یا کم سے کم جسم کو دوسرے کاموں سے فرصت مل جاتی ہے تو اسے سوچنے اور سمجھنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ میں نے بھی خوب سوچا اور سمجھا۔

اور آج میں خود اورنگ زیب روڈ گیا تھا تاکہ اس کی سہیلی سے اگر وہ اس کی سہیلی تھی، اس کی کیفیت معلوم کروں اور اگر وہ خود مل جائے تو کچھ باتوں کا فیصلہ کر لوں۔ گو اب یہ سب باتیں محض بیکار تھیں۔

جب میں نے خادم کو اپنا ملاقاتی کارڈ دیا تو مجھے بھی گول کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کارڈ پر میں نے دوسری طرف مس ناز لکھ دیا تھا۔

ابھی مجھے گول کمرے میں بیٹھے چند لمحے گزرے تھے کہ سامنے کے

دروازے کے شیشے میں مجھے دو آنکھیں نظر آئیں۔ میں ان کی طرف دیکھتا تھا کہ غائب ہو گئیں۔ مجھے وہ آنکھیں ناز کی آنکھیں معلوم ہوئیں۔ اس کے بعد وہ نوکر آیا اور کہنے لگا۔ "بی بی جی کہتی ہیں کہ جن سے آپ ملنے آئے ہیں۔ وہ کلکتہ سے ابھی واپس نہیں آئیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو مجھے معلوم تھا۔ میں تو بی بی جی ہی سے ملنے آیا تھا۔"

وہ چلا گیا اور پھر آکر کہنے لگا کہ "وہ کہتی ہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔"

مجھے بُرا تو معلوم ہوا۔ تاہم میں نے کہا۔ "میں انتظار کر لوں گا۔ لیکن مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔"

اُس نے آکر پھر ان کی طرف سے معذوری ظاہر کی ——— اور میں ناراض ہو کر واپس چلا آیا۔

تمام رستے یہ خیال آتا رہا کہ وہ ناز خود تھی یا اس کی سہیلی تھی۔ اگر سہیلی تھی تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگر ناز تھی تو اس نے یہ میری بہت بڑی توہین کی ہے۔ عشق کی توہین اور حسن کے ہاتھوں! اب مجھے یہ خیالات چھوڑ دینے چاہئیں۔ اب مجھے خودداری سے کام لینا چاہیئے۔ آخر میں کہاں تک گرتا چلا جاؤں گا۔ میں گرنے کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہوں۔ اب اس سے زیادہ نہیں گر سکتا۔

پھر سوچنے لگا کہ وہ ناز نہیں ہو سکتی۔ لیکن دروازے کے شیشوں میں سے جو آنکھیں مجھے نظر آئی تھیں۔ وہ بلاشبہ ناز کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔ وہ ناز تھی اور صرف ناز۔ لیکن اس نے ملنے سے انکار کیوں کر دیا۔ اگر وہ آکر دو چار لمحوں کے لئے مجھ سے باتیں

کر لیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ کیا اب وہ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی کہ سامنے بھی آنا نہیں چاہتی۔ پھر وہ شیشوں میں سے کیوں جھانک رہی تھی کیا پہلے کی طرح اس کا خیال تھا کہ اب کے بھی احسن کا وہی دوست نہ ہو۔

ہاں تو میں اور زیادہ نہیں گر سکتا۔ آج میں عہد کرتا ہوں کہ اب کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کروں گا۔ اور نہ کبھی خود سے ملنے ہی جاؤں گا۔ لیکن وہ تو کبھی ملنے کے لئے آنے سے رہی اور اس صورت میں کبھی ملاقات نہ ہو گی —— نہ ہو، اب میں دل کے آرام کے لئے اپنی خودداری کا اور زیادہ خون نہیں کر سکتا۔ آفتاب سچ کہتا تھا کہ عشق اگر خوددار نہیں تو لعنت ہے۔
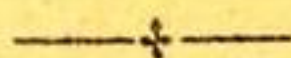
۲۹۔ اکتوبر ۴۳ء

کئی دن بہت بیتابیوں میں بسر ہوئے۔

دل اور عقل میں سخت جنگ ہوتی رہی۔ عقل کو سات برس ضائع ہونے کا افسوس تھا۔ دل کہتا تھا یہ سات سال ضائع نہیں ہوئے۔ بلکہ ساری زندگی کا نچوڑ ہیں۔ اور ان سات برسوں میں جو وقت ناز کے ساتھ گذرا اس کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ تاج کی ایک رات اس قابل ہے کہ اس پہ زندگیاں نثار کر دی جائیں۔ عقل نے چڑ کر کہا "لیکن حاصل کیا ہوا؟ ایک مرد اور عورت نے تاج محل کی طرف حسرت اور محبت سے تکتے ہوئے ساری رات آنکھوں میں گذار دی۔ اتنی سی بات پر تم زندگیاں

نثار کرتے ہو — توبہ توبہ! اگر میرا قبضہ انسانوں پر سے اٹھ جائے تو سب پاگل ہو جائیں۔"

دل کو عقل کی یہ بات بری معلوم ہوئی۔ ناراض ہو کر بولا۔ "بی عقل صاحبہ! محبت کی باتیں تمہارے فہم سے بلند ہیں۔ اب اس میں میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتی ہو؟"

قصہ مختصر عقل کے ساتھ خود مجھے بھی اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کبھی کبھی دل کوئی خوش کن بات کہہ دیتا تھا۔ ورنہ میں یہی سوچتا رہا کہ زندگی کے بہترین سال — جوان ارادوں اور جوان امنگوں کے بہترین سال ضائع کر دیئے۔ بدن میں طاقت تھی، جوش تھا۔ اگر محبت — منحوس محبت میں مبتلا نہ ہوتا تو کیا کچھ نہ کر لیتا۔ اگر سیاست ہی میں حصہ لیتا رہتا تو آج میری لیڈری مسلمہ چیز ہوتی۔ جہاں جاتا لوگ آنکھیں بچھاتے۔ اور پھر شاید ناز بھی مجھ سے ملنا فخر تصور کرتی۔ عقل سچ کہتی ہے کہ اس دل نے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

میں بار بار یہی سوچتا ہوں کہ آدمی محبت کیوں کرتے ہیں۔ آخر یہ بیماری پیدا ہی کیوں ہوتی ہے۔ کیا اس کے جراثیم خون میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں؟ یا کسی بیمار کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان کو کسی خاص انسان ہی سے کیوں محبت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس سے کہیں زیادہ بہتر انسان اسے ملتے ہیں۔ خوبصورتی تو اس کی وجہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ معمولی خدوخال کی ایک لڑکی پر عاشق ہو جائیں۔ اور دنیا کی حسین ترین لڑکی کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ خود مجھے ایک خاص قسم کا حسن پسند ہے۔ جہاں جہاں اس کا جتنا پرتو

نظر آتا ہے۔ میں اسے اتنا ہی پسند کرتا ہوں۔ اور چونکہ ناز میں وہ حسن ——— وہ بے پناہ حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے میں اسے بے انتہا چاہتا ہوں۔

اس بیماری سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ حکماء کا قول ہے کہ کوئی صورت نہیں۔ لیکن میرے خیال میں ایک صورت ہے۔ اگر انسان کسی کے چہرے یا جسم کی طرف کبھی غور سے دیکھے ہی نہیں تو ممکن ہے کہ وہ اس بیماری سے بچا رہے۔ یا اگر دیکھے تو عیب ڈھونڈھنے لگے۔ چہرے میں یہ کمی ہے۔ اعضا میں یہ نقص ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی کمی، کوئی نہ کوئی نقص ضرور نظر آجائے گا۔ کیونکہ خاکم بدہن خدا نے جو بھی چیز بنائی ہے وہ نامکمل ہے۔

لیکن ایک دفعہ یہ بیماری لگنے کے بعد پھر قریب قریب ناممکن ہے کہ اس سے نجات ملے۔ اگر آدمی میری طرح سچی اور پاک محبت کے حق میں ہو۔

———+———

۱۳۔ نومبر ۱۹۴۳ء

آج مجھے ناز کا خط ملا تھا۔ جس میں اس نے مجھ سے کافی ہاؤس میں پانچ بجے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اس مختصر سے خط نے میرے جذبات میں ہل چل سی ڈال دی ہیں دس بارہ دن سے اُسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ یا شاید غم سہتے سہتے عادت سی پڑ گئی تھی۔ اور اب غم میں وہ شدت اور تلخی محسوس نہ ہوتی تھی۔

جس سے زندگی وبال جان بن جاتی ہے۔ لیکن ناز پھر بلا رہی تھی۔ پھر ناقابل برداشت آفات و آلام میں مبتلا کرنے کے لئے زندگی کو پھر ایک نہ اٹھائے جانے والے عذاب میں پھنسانے کے لئے۔ لطف یہ کہ دل بھی اس مرتبہ عقل کا ہمنوا تھا۔ دونوں کی یہ رائے تھی کہ جانا نہیں چاہئے۔ میں سارا دن اس بات پر غور کرتا رہا اور اپنے عہد کے متعلق بھی سوچتا رہا۔ آفتاب اور قریشی تو یہاں تھے ہی نہیں کہ ان سے رائے لیتا۔ اور کسی کو میں نے ہمراز نہیں بنایا۔

غرضکہ سارا دن بیت گیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ جب خط آیا تو اس وقت تو دل عقل کے ساتھ تھا۔ لیکن جوں جوں شام ہوتی رہی۔ یہ نامراد عقل سے الگ ہوتا رہا۔ اور پانچ بجے تک بالکل باغی ہو گیا تھا اور اس کی بغاوت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں تیار ہو کر کافی ہاؤس پہنچ جاؤں لہذا پانچ بجے میں نے تیار ہونا شروع کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گھنٹہ دیر میں پہنچا۔

مجھے امید نہ تھی کہ مس ناز اتنی دیر انتظار کرے گی لیکن دل ہی دل میں دعائیں مانگتا جا رہا تھا کہ اسے خدا وہ انتظار کر رہی ہو۔

کافی ہاؤس پہنچا تو اندر داخل ہوتے ہی میں نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی۔ مگر ناز کہیں نظر نہ آئی۔ یہ چاہنے والے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ پہلے تو امید کے خلاف امید باندھتے ہیں۔ پھر جب وہ پوری نہیں ہوتی تو افسوس کرتے ہیں۔ اس کے موجود نہ ہونے پر جو مایوسی مجھے ہوئی اس نے مجھے اس قابل نہ چھوڑا کہ کھڑا رہ سکوں یا واپس آ سکوں۔ لہذا ضروری محسوس ہوا کہ بیٹھ کر کافی کی ایک پیالی زہر مار کر لوں۔

دائیں طرف کونے کی ایک میز خالی تھی۔ وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اور با دل ناخواستہ "آرڈر" بھی دے دیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت سیاہ ریشمی برقعہ پہنے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ سب کی آنکھیں اس طرف اٹھ گئیں۔ لڑکیاں اور عورتیں اکثر کافی ہاؤس میں تنہا آجاتی ہیں۔ مگر برقعہ والی عورت کا تنہا اس طرح بیدھڑک آنا، سب کے لئے تعجب کی بات تھی۔ پھر وہ سیدھی میرے میز کے قریب آئی اور میرے بالمقابل کرسی پر نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گئی، اس کے اس فعل پر مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

تاہم میں کچھ بولا نہیں۔ البتہ یہ خیال ضرور آیا کہ نازکو برقعہ اوڑھ کر آنے کی کیا مصیبت آئی ہے۔

بوائے نے اس کے قریب آکر کہا "جی صاحب کیا لاؤں؟" ...

وہ میز کی طرف اشارہ کر کے بولی "یہی کافی ہے۔"

اس کی آواز سن کر تو معاملہ شک وشبہ سے بلند ہو گیا تھا۔ لہذا میں نے کہا "سلام عرض ہے آپ تشریف لے آئیں۔"

کہنے لگی۔ "یوں فرمایئے کہ میں آگیا۔"

"بہرحال آپ سے تو میں پہلے ہی آیا ہوں۔"

"جی نہیں، میں ٹھیک پانچ بجے یہاں پہنچ گئی تھی۔ لیکن پندرہ بیس منٹ انتظار کر کے چلی گئی تھی۔ اب کوٹھی واپس جا رہی تھی کہ جاتے جاتے خیال آیا کہ ایک مرتبہ اور دیکھتی چلوں۔ گو آپ کے ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ دیر ہو گئی۔ ہاں تو میرے لئے کیا حکم تھا۔ اور

یہ آج آپ نے برقعہ کیوں اوڑھ رکھا ہے۔"

"آپ کافی تو نوش فرمالیں پھر باتیں کریں گے۔"

"آپ بھی تو نوش فرمائیے۔ آپ کے لئے اور منگاؤں۔"

"میں ابھی ابھی پی کر گئی تھی اور کی خواہش نہیں۔"

میرے اصرار پر بھی اس نے کچھ پینے کی ہامی نہ بھری۔ تو میں خاموش ہو گیا اور جلدی سے فراغت پا کر کہا۔

"فرمائیے میں حاضر ہوں۔"

اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تو آئیے۔"

وہاں سے نکل کر ہم سامنے کے پارک میں ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ "خدا کے لئے اب تو اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیجئے۔"

"یہ چہرہ اس قابل نہیں رہا کہ آپ اسے دیکھنے کے لئے بیتابی کا اظہار کریں۔"

میں سمجھا کہ شاید اپنی بے وفائیوں پر پشیمان ہے اور ندامت کی وجہ سے ایسا کہتی ہے۔ لہٰذا میں نے کہا۔ "میرے لئے یہ چہرہ کبھی نہیں بدل سکتا۔ اس پر ہمیشہ فرشتوں کی سی معصومیت اور بادشاہوں کا سا وقار برستا رہے گا۔"

نہایت درد سے بولی "میری اوڑھنی میں آگ لگ گئی تھی جس سے یہ بھی جل گیا۔ اسی لئے آپ بیمار تھے میں آپ کو دیکھنے کے لئے نہ آسکی اس سے چند دن پہلے یہ حادثہ ہوا تھا۔"

مجھے یہ بات سن کر بہت زیادہ رنج ہوا اور میرے دل میں اُس کی اتنے عرصہ سے دبی ہوئی محبت ایک دم جوش مارنے لگی۔

میں نے درخواست کی۔ "لیکن مجھے ایک جھلک تو دکھا دیجئے میں یہ تو دیکھ سکوں کہ ——"

وہ درمیان ہی میں بول اٹھی۔ "احسن! اب میری صورت بہت بھیانک ہو گئی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر شاید ابھی ابھی یہاں سے اُٹھ کر چلے جائیں اور پھر کبھی میرے پاس بھی نہ پھٹکیں۔"

"افسوس ہے کہ مجھے آپ نے اب تک بھی نہیں سمجھا۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے آپ سے روحانی محبت ہے۔ آپ کی صورت اگر خدا نہ کرے بھیانک ہو گئی ہے تو میری بے پناہ محبت پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑے گا۔ میں آپ کی روح سے محبت کرتا ہوں آپ کے جسم سے نہیں۔ خدا کے لئے اپنی صورت ایک بار دکھا دیجئے میں اُسے دیکھنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔"

کتنی عجیب بات تھی۔ ایک طرف تو میں کہتا تھا کہ میں آپ کی روح سے محبت کرتا ہوں۔ اور دوسری طرف اس سے صورت دکھانے کی درخواست کر رہا تھا۔

لیکن اس نے نقاب نہیں الٹی۔ یہی کہتی رہی "میری صورت آپ تصور کی آنکھوں سے دیکھئے۔ تاکہ آپ کو وہی صورت دکھائی دے جسے دیکھنے کے آپ متمنی ہیں۔"

جب وہ کسی صورت اپنی صورت دکھانے کے لئے تیار نہ ہوئی تو میں نے ہار کر کہا۔ "اچھا خیر یہ بتائیے کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں، ہر قربانی دینے کے لئے آمادہ۔ بس آپ حکم دیجئے اور دیکھئے کہ میں کیسی مستعدی سے اُسے بجا لاتا ہوں۔"

اُس نے دردآمیز لہجہ میں کہا۔ "میں نے آپ کو یونہی —— ایک

فوری جذبہ کے تحت — خط لکھ دیا تھا۔ میرا ارادہ ہے کہ اب میں گوشہ نشینی اختیار کر لوں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک مرتبہ مل لینا چاہتی تھی۔"

اس کی بات سے میرا دل بھر آیا اور میں نے گلوگیر آواز سے کہا۔ "ناز! میں نے آج تک کبھی خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھا۔ لیکن اب یہ ناگوار حادثہ ہوگیا ہے۔ تو میں اپنا نظریہ بدلنے کے لئے تیار ہوں — لیکن — ہاں — آپ نے اُن صاحب سے شادی کر لی تھی کیا؟ آجکل وہ کہاں ہیں؟

اُس نے ایک آہ بھری اور بولی۔" ان باتوں کا ذکر کرکے مجھے اور زیادہ رنج میں گرفتار نہ کیجئے۔ اچھا اب میں رخصت چاہتی ہوں — شاید کل میں دہلی سے کہیں دُور چلی جاؤں۔ اگر آپ میری کسی بات سے ناراض ہوں تو میں دست بستہ معافی چاہتی ہوں"

وہ جانے کے لئے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا ذرا دیر اور بیٹھیے۔ لیکن وہ سڑک کی جانب چلنے لگی۔ میں نے کہا۔" اچھا جاتے جاتے تو کم سے کم اپنا چہرہ دکھاتی جائیے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔

سڑک پر جاکر اس نے تانگہ والے کو آواز دی اور اورنگ زیب روڈ چلنے کے لئے کہا۔ تانگہ میں سوار ہو کر بڑے درد سے بولی — "خدا حافظ!"

۱۳ار نومبر سنہ ۱۹۴۳ء (۱۱ بجے شب)

جانے آج نیند کمبخت کہاں چلی گئی کہ آتی ہی نہیں دل ہے کہ پریشان ہے۔ طبیعت ہے کہ اڑی جاتی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ابھی اڑ کر اورنگ زیب روڈ پہنچ جاؤں اور ناز سے تفصیل کے ساتھ گفتگو کروں۔ اگر اس نے شادی کر لی ہے۔ اور ان کی خانگی زندگی خوشگوار ہے تو خیر ورنہ اس کی خانگی زندگی خوشگوار بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے آپ کو بھی پیش کر دوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کی صورت خراب ہونے پر بھی اس سے محبت کر سکتا ہوں ممکن ہے کہ یہ میرا خیال ہی ہو۔ میں اس کی صورت دیکھنے کے بعد اتنی بے پناہ محبت نہ کر سکوں۔ لیکن فی الحال مجھے یہی یقین ہے کہ میں اس سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کر سکتا ہوں۔

۱۴ار نومبر سنہ ۱۹۴۳ء (۳ بجے صبح)

ذرا دیر کو آنکھ لگی تھی کہ خواب میں ان کی کوٹھی پر جا پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ناز صبح ہی صبح کلکتہ چلی گئی ہے۔ اور میرے لئے خط چھوڑ گئی ہے۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھول کر پڑھا۔ کچھ اس قسم کا

مضمون تھا

"میں جا رہی ہوں آپ کو افسوس ضرور ہو گا۔ کل رات آپ کی باتیں سن کر مجھے بھی بہت افسوس ہوا تھا۔ آہ اگر آپ مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے تو خدا کی قسم مجھے خوشی حاصل ہوتی۔ آپ کا "ظرف" کتنا بڑا ہے کہ اتنا کچھ معلوم ہونے پر بھی آپ نے مجھ سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ یا پھر آپ حالات سے ناواقف ہیں۔

میں چاہتی تو آپ سے شادی کر لیتی۔ آپ تو اس کے لئے تیار بیٹھے تھے، اور بقیہ زندگی بے فکری سے بسر کرتی۔ آخر آپ جیسے چاہنے والے کی آغوش میں بھی اگر بے فکری میسر نہ آئے تو اور کہاں آئے گی؟ آہ! آپ کیسے بھولے ہیں۔ کہتے تھے میں تمھارے جسم سے نہیں تمھاری روح سے محبت کرتا ہوں۔ کاش آپ میری روح دیکھ سکتے!

جی چاہتا ہے کہ جاتے جاتے ایک نصیحت کرتی جاؤں۔ آپ جس محبت کے خواب دیکھتے ہیں وہ آج سے بیس سال پہلے تو شاید کہیں مل جاتی۔ لیکن آج بالکل ناپید ہے۔ اور پھر ایسی محبت کے لئے آپ نے نئی روشنی کے کالج کا ماحول کیوں ڈھونڈا۔ کسی بہت پرانے خاندان میں اس کی تلاش کی ہوتی۔ آجکل محبت جیسی فرسودہ چیز پر وقت جیسی قیمتی شئے قربان نہیں کی جا سکتی۔ یہ سات برس جو آپ نے ضائع کر دیئے ہیں۔ کاش آپ نے ان میں کوئی کام کیا ہوتا!"

خط ختم کیا ہی تھا کہ پریشانی میں آنکھ کھل گئی۔

(۵ بجے صبح) ——

جب سے آنکھ کھلی ہے کسی پہلو قرار نہیں۔ بہت دیر تک پڑا کروٹیں

بدلتا رہا۔ آخر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ روشنی تیز کی اور کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ کتاب میں بھی اس وقت جی لگتا ہے جب دل کو قرار ہو۔ اور جب دل کو قرار ہی نہ ہو تو کتاب میں جی لگتا ہے نہ کسی اور چیز میں۔ ایک مرتبہ جی میں آیا کہ ابھی بائیسکل اٹھا کر چل دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میں خود تو پریشان ہو رہا ہوں انھیں بھی کیوں پریشان کروں آخر انھیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس وقت تک جاگ رہی ہوں گی۔

عجیب عجیب خیالات آ رہے ہیں۔ کل شام سے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرے جسم کے روئیں روئیں سے ان کی محبت پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے اور کائنات میں چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ مجھے ہر طرف ان کی محبت دکھائی دے رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں از سرتاپا محبت ہی محبت ہوں۔ میری زندگی کا مقصد محبت کرنا تھا۔ اور بس! اور اب وہ محبت اپنے عروج کو پہنچنے والی تھی۔ میں نے سوچا اگر ناز کا چہرہ خراب ہو گیا ہے تو میں اپنی آنکھیں کیوں نہ پھوڑ لوں۔ نہ آنکھیں ہونگی نہ میں اس کی جلی ہوئی صورت دیکھ سکوں گا۔ پھر خیال آیا آنکھیں پھوڑنے کا تو یہ مطلب ہے کہ میں اس کی خدمت ہی نہ کر سکوں گا۔ اور الٹا اس کے لئے بار ثابت ہوں گا۔"

یہ مجھے اچانک آفتاب کا خیال کیوں آیا؟ نہیں مجھے اب اس کے فلسفے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک قربانی دینے لگا ہوں اور میرا دل اس بات سے بہت خوش ہے کہ آخر میں مس ناز کے کچھ کام آسکوں گا۔ مگر یہ آفتاب کیا کہہ رہا ہے ــــ؟ اب مجھ میں اس کی باتیں سننے کی قوت نہیں۔ میں نے اپنے کانوں کو شہادت کی دونوں انگلیوں سے بند کر لیا ہے لیکن آفتاب کی

آواز بدستور آرہی ہے ــــ اے خدا رحم!

ـــــــ ٭ ـــــــ

۲۰ر نومبر ۱۹۴۳ء

وہ بھی کیا وقت تھا جب میں ۱۴ر کی صبح کو ۹ بجے کے قریب ان کی کوٹھی پر پہنچا۔ اس کی سہیلی بڑے تپاک سے ملی ۔ مگر اس کے چہرے پر انتہائی حزن و ملال برس رہا تھا۔ اور اس کی پلکوں پر آنسو کھیل رہے تھے ۔ مجھے ایسا دکھائی دیا کہ وہ کانپ بھی رہی تھی ۔

اس نے معمولی آؤ بھگت کے بعد بتایا کہ اگر آپ شام کو آئیں گے تو ناز سے ضرور ملاقات ہو سکے گی ۔ رات وہ خلاف معمول بہت زیادہ دیر تک جاگتی رہیں ۔ اب کوئی ایک گھنٹہ ہوا ان کی آنکھ لگی ہے ۔ اس صورت میں انھیں بیدار کرنا شاید آپ بھی گوارا نہ کریں ۔

میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ درحقیقت ناز کی صورت جلنے کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے ۔

میں نے کہا مجھے ناز سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے جب تک وہ جاگیں میں یہیں بیٹھ کر انتظار کر لوں گا ۔ اس پر اس نے بڑی لجاجت سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور بولی کہ ہمارے یہاں چند مہمان آ رہے ہیں ۔ اس لئے اگر آپ شام کو تشریف لائیں تو بہتر ہوگا ۔

اور جب میں شام کو گیا تو وہ صبح سے بھی زیادہ غمگین تھی ۔ اس مرتبہ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ انھیں

ضبط نہ کر سکی۔

بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ ناز نے رات کو کچھ کھا لیا تھا۔ اور صبح اس نے یہ بات اس لئے نہیں بتائی تھی کہ اُسے ناز کی ایک خواہش کا احترام تھا۔

پھر اس نے مجھے ایک خط دیا — جس میں ناز نے جلدی میں دو تین فقرے گھسیٹ رکھے تھے۔

"اس وقت جبکہ میری صورت حد درجہ مسخ ہو چکی ہے آپ سے شادی کرنا انتہائی شرمناک قسم کی خود غرضی ہوتی جو میں گوارا نہ کر سکی گو آپ اس کے لئے بالکل آمادہ تھے۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں میرے لئے اب صرف یہی اک چارۂ کار تھا۔ امید ہے آپ معاف کر دیں گے!"

گلنار

گلنار اور آفتاب کو اُن کا ایک رشتہ دار ملنے آیا تھا۔ گو چائے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن گلنار اسے دیکھتے ہی چائے کا اہتمام کرنے لگی اور اخلاق زیادہ دیر ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ گلنار کو ایک نظر دیکھنے گیا تھا اور ایک نظر دیکھنے کے بعد چاہتا تھا کہ فوراً واپس چلا جائے۔ لیکن گلنار شاید اُسے کچھ دیر بٹھانا چاہتی تھی کچھ نہیں تو چائے ہی بنانے لگی۔ اور دراصل اخلاق ان کے یہاں گیا ہی تھا اُس کے بلانے پر۔ آفتاب اور گلنار وطن سے باہر ہی رہتے تھے اور اخلاق بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آفتاب چھٹی لیکر بچوں سمیت آیا ہوا تھا کہ اخلاق بھی تین چار دن کیلئے آگیا۔

وطن پہنچ کر اخلاق کو پتہ چلا کہ آفتاب اور گلنار بھی آئے ہوئے ہیں۔ اس خبر سے اُسے خوشی تو ہوئی لیکن صرف دو چار لمحوں کے لئے۔ پھر ایک نامعلوم غم اُس کے دل پر مسلط ہو گیا اور اسی غم کا نتیجہ تھا کہ اس نے ان سے ملنے نہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ سوچا کہ آفتاب بازار میں یا کسی رشتہ دار کے یہاں ضرور ضرور مل جائے گا تو اچھا ہے لیکن گلنار۔۔۔۔ گلنار کو دیکھنے کی اس میں

طاقت نہیں تھی۔ اور اس لئے وہ اسے دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا۔ مگر ابھی چھٹی کا ایک دن باقی تھا کہ گلنار رات کو ان کے یہاں آئی۔ چاندنی رات تھی۔ اخلاق دن چھپتے ہی دریا کی سیر کو چلا گیا تھا اور وہاں دریا کے صاف و شفاف پانی نے اور چاندنی نے کچھ بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دی تھیں۔ وہ وہاں مست و بے خود بنا بیٹھا رہا اور ادھر گلنار اس کا انتظار کر کے چلی گئی۔

اخلاق واپس آیا تو بہن نے بتایا کہ گلنار آئی تھیں بڑی دیر تک بیٹھی رہیں۔ یہ کچھ نہ بولا۔ اس نے پھر کہا وہ کہہ گئی ہیں کہ بھائی اخلاق سے کہنا ہمیں بغیر ملے نہ چلے جائیں۔ آخر ایسا بھی کیا خون سفید ہو گیا ہے کہ ۔۔۔

اس نے پوری بات نہیں سنی۔ دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر آیا تو بہن نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ وہ کہہ گئی ہیں ایسا بھی کیا خون سفید ہو گیا ہے کہ چھٹی آئے ہوئے تین دن ہو گئے اور آ کر شکل تک نہیں دکھائی۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولا اور پھر باہر جانے لگا تو اس کی والدہ نے کہا۔ "اب پھر کہاں چلے۔ میں کب سے تمہارے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے امی۔"

"کیا ظہور کے یہاں کھا آئے؟"

اخلاق نے ان کی بات نہیں سنی یا اگر سنی تو جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

دوسرا دن ہوا عقل کہتی تھی کہ گلنار سے بغیر ملے ہی واپس چلا جانا چاہئے دل کہتا تھا کہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ وہ غریب خود آئی اور تم نہیں ملے تو پیغام دے گئی۔ اگر اب بھی تم نہ گئے تو اس کے دل پہ کیا گزرے گی عقل نے اس دلیل کے جواب میں کہا اور تمہارے اپنے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔

دل بولا کہ انسان کو اپنی فکر نہیں کرنی چاہئے اچھا انسان وہ ہے جو دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد ان کے یہاں چلا ہی گیا۔ آفتاب گھر ہی میں موجود تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ گلنار بولی "بھائی اخلاق سلام"۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا سلام کا جواب دیا اور دم بخود رہ گیا۔ اب اس کے سامنے وہ گلنار نہیں تھی جسے اس نے آج سے چار برس پہلے دیکھا تھا اور جو گلنار اس وقت سے ہمیشہ اس کے تصور میں پھرا کرتی تھی۔ اب اس تندرست و توانا اور حسین و جمیل گلنار کی جگہہ بیمار اور نحیف و ناتواں گلنار نظر آئی۔ اس کا رنگ ہلدی جیسا زرد ہو گیا تھا اور ہاتھوں یا چہرے پر کہیں خون کی سرخی نظر نہ آتی تھی۔

اخلاق سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ ایک دم چار برس کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ ایک دم وہ محبت جو اس طویل عرصہ میں سمٹ سمٹ کر دل میں جمع ہو کر رہ گئی تھی پھر اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ گلنار کی یہ حالت دیکھ کر اسے بے انتہا رنج پہنچا۔ وہ چار برس تک یہ سمجھتا رہا تھا کہ گلنار آرام سے ہے اور پر مسرت زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن اس کا پیلا رنگ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں اور اس کے پچکے ہوئے رخسار سب اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ گلنار کے دن رنج و غم میں بسر ہوتے ہیں ــــ

اخلاق ذرا دیر بیٹھا تھا کہ دل نے کہا چلئے اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا عقل طعنے دینے لگی "میں پہلے ہی نہ کہتی تھی وہاں نہ جایئے"

اس نے رخصت چاہی اور گلنار بولی "ابھی چائے تیار ہوئی جاتی ہے"

چائے پی کر جائیے گا "

گلنار چائے بنا رہی تھی کہ بچی رونے لگی۔ گلنار نے اُسے اپنے پاس پیڑھے پر بٹھا رکھا تھا۔ اخلاق کے جی میں آیا کہ بچی کو گود میں اٹھا لے اور آفتاب پر تعجب ہوا کہ یہ کیسا بے فکر بیٹھا باتیں بنا رہا ہے۔ بچی کو کیوں نہیں چپ کراتا۔ کہ آفتاب غصہ سے بولا۔

"کیسی بے وقوف عورت ہے۔ بچی رو رہی ہے۔ یہ نہیں کرتی کہ اُسے گود میں اٹھا لے "

اخلاق کو آفتاب کا یہ بے موقع غصہ بہت ہی بُرا معلوم ہوا۔ سوچنے لگا کہ غلطی اپنی ہے اور ناراض ہوتا ہے گلنار پر۔ لیکن گلنار آفتاب کی بات کے جواب میں صرف مسکرا پڑی۔ اور گلنار کے مسکرانے سے اخلاق کو وہی موتی جیسے سفید دانت دکھائی دئے جو چار سال پہلے اس کے مسکرانے پر نظر آتے تھے۔ گلنار بالکل بدل گئی تھی مگر اس کے دانت نہ بدلے تھے۔ اُن میں اب تک وہی موتیوں کی آب تھی اور وہی ہیرے کی چمک۔

بچی بدستور روتی رہی۔ اخلاق باتیں کرتے کرتے اٹھا اور بولا۔

"بچی رو رہی ہے میں اسے گود میں لے لوں "

آفتاب بولا۔

"اجی آپ بیٹھیے" اور پھر پہلے سے بھی زیادہ غصہ سے گلنار سے کہنے لگا۔

"اگر تو نے اب بھی اسے گود میں نہ اُٹھا تو میں آ کر چائے کا پکتا پکتا پانی تیرے سر میں ڈال دوں گا "

گلنار نے پہلے سے زیادہ مسکراتے ہوئے بچی کو گود میں لے لیا۔ اور اخلاق کو محسوس ہوا کہ آفتاب نے چائے کا کھولتا ہوا پانی گلنار کے سر میں

ڈالنے کی بجائے اخلاق کے دل پر ڈال دیا ہے۔

چائے تیار کر چکی تو گلنار کو خیال آیا کہ کچھ توس بھی بنا دوں۔ آفتاب سے بولی۔

"دیکھئے صبح میں نے مکھن کی دو لوس ٹکیاں آپ کے توسوں میں لگا دی تھیں اب اگر اور مکھن لا دیتے ——"

اس نے اپنی بات نامکمل ہی چھوڑ دی اور مسکرانے لگی جیسے اُسے خوف تھا کہ آفتاب ناراض نہ ہونے لگے۔

اخلاق نے کہا۔

"بھئی مکھن وکھن کی ضرورت نہیں میں خشک توس ہی کھالوں گا اور اول تو توسوں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔"

گلنار بولی خشک توس کیوں کھائیں گے آپ۔ یہ ابھی مکھن لا دیتے ہیں ——"

آفتاب نے کہا "ہاں ہاں میں ابھی مکھن لا دیتا ہوں"۔

اس کے جانے پر اخلاق اور گلنار نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پھر دونوں نے ایک ساتھ نگاہیں نیچی کر لیں۔ کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر گلنار بولی۔

"یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے بھائی اخلاق —— تمھارے دشمن تو ایسے کمزور ہو گئے کہ ——"

خبر نہیں وہ ابھی اور کیا کہتی۔ اخلاق بیچ ہی میں بول پڑا۔

"کبھی تم نے اپنی حالت بھی شیشے میں دیکھی"۔

"کیوں مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو بھلی چنگی ہوں۔" گلنار نے مسکراتے

ہوئے کہا۔ اس کے مسکرانے پر اخلاق کی نظروں میں رابیل کی تازہ تازہ سفید کلیوں کا تصور پھر گیا۔

"صورت تو دیکھو جیسے برسوں کی بیمار ہو اور کہہ رہی ہو کہ میں بھلی چنگی ہوں۔ خدا آفتاب کو عقل دے کہ وہ تمھاری قدر کرنے لگے۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کا دل دکھا لیکن منہہ پر آئی ہوئی بات روکنے کا وہ عادی نہیں تھا۔

"آفتاب میری مناسب قدر کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کی میں مستحق بھی تو نہیں۔"

اخلاق کے جی میں آیا کہ کہے "یہ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تم کتنی قدر کی مستحق ہو لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ اور صرف اتنا کہا۔

"یہ مناسب قدر ہے!"

اور تم اپنی بیوی کی کتنی قدر کرتے ہو؟" گلنار نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"لیکن میں اُسے اس طرح بُرا بھلا بھی تو نہیں کہتا۔"

"بُرا بھلا تو بیشک نہیں کہتے لیکن —— مجھے زیب نہیں دیتا کہ عمر میں چھوٹی ہو کر نصیحتیں کروں۔ لیکن شوہر ہونے سے جو فرائض تم پر عائد ہو گئے ہیں انھیں پورا کرنا تمھارا سب سے بڑا فرض ہے۔"

"لیکن گلنار ——" وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔ گلنار فوراً بول اُٹھی۔

"اخلاق یہ دنیا ہے یہاں آدمیوں کو منھ مانگی مرادیں نہیں مل جاتیں"

"لیکن مرادیں نہ ملنے پر بھی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ خوش رہو۔"

ابھی گلنار اس کی بات کا جواب دینے نہ پائی تھی کہ آفتاب کھن

لے کر آگیا۔

گلنار نے جلدی جلدی توسوں پر مکھن لگایا اور چائے تیار کر کے ان دونوں کے آگے رکھ دی۔

چار برس کی مدت میں اخلاق کو پہلی مرتبہ زندگی دلکش معلوم ہوئی۔ بھائی اخلاق یہ توس اور کھائیے۔ بھائی اخلاق ایک پیالی اور پیجیے۔ بھائی اخلاق لکھنؤ میں رہ کر بالکل ہی لکھنوی بن گئے آپ تو۔ ان الفاظ میں ایسا رس تھا کہ اخلاق کو زندگی بے حد شیریں معلوم ہونے لگی۔

گلنار کا مخاطب کرنے کا یہ طریقہ اُسے بہت ہی پسند تھا۔ چار برس پہلے انھیں الفاظ نے اُسے گلنار کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور یہ الفاظ ہمیشہ اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ علیگڑھ سے کالج بند ہونے پر گھر آیا تھا کہ ماں باپ کی صحبت میں کچھ دن گزار کر کشمیر چلا جائے۔ گلنار بھی اپنے والدین کے ہمراہ وطن آئی ہوئی تھی اور اخلاق کے یہاں مہمان تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ایک دوسرے کو انھوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ادھر اخلاق نے گھر میں قدم رکھا اور ادھر گلنار نے کہا بھائی اخلاق سلام۔ یہ دیکھتا ہی رہ گیا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ ماں نے بتایا کہ یہ تمھاری بہن ہے گلنار —— اُس کی نظروں میں وہ سارا نقشہ پھر گیا۔ کتنے دن گلنار ان کے یہاں مہمان رہی اور کتنے دن یہ کشمیر جانے کا ارادہ ملتوی کرتا رہا۔ پھر جب اس نے اپنی ماں سے کہا کہ گلنار کو آپ اتنا پسند کرتی ہیں کیا یہ آپ کو بہو کی حیثیت سے بھی پسند آجائے گی۔ اور ماں کے بتانے پر کہ وہ پہلے ہی اسے بہو بنانے کے لئے انتخاب کر چکی ہیں۔ اخلاق کی باچھیں کھل گئیں اور جب کچھ دنوں

میں نسبت کی ابتدائی رسم ادا کی گئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گویا دونوں جہان کے خزانے مل گئے۔ بعد کے واقعات کی یاد بڑی تلخ تھی۔ کسی بات پر گلنار اور اخلاق کی ماں میں لڑائی ہو گئی اور یہ لڑائی آہستہ آہستہ اتنی بڑھ گئی کہ دونوں نے گلنار اور اخلاق کی منگنی منسخ کرنے کا اعلان کر دیا اور صرف اعلان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دونوں کو یہ شوق سوار ہوا کہ فوراً ہی کہیں دوسری جگہہ بات پکی کر دی جائے۔ لہذا گلنار کے لئے آفتاب کا انتخاب کیا گیا اور اخلاق کے لئے ایک اور رشتہ دار لڑکی پسند کی گئی۔ اخلاق کی والدہ نے اس سارے جھگڑے اور نئے انتخاب کے متعلق اخلاق کو اطلاع دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اور بے چاری گلنار تو لڑکی تھی وہ اپنی ماں کے آگے زبان نہ ہلا سکتی تھی اور اس طرح دو محبت کرنے والے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا گیا۔

اخلاق یہ باتیں یاد کر رہا تھا اور چائے پیتا جا رہا تھا۔ گلنار شاید بھول چکی تھی یا شاید وہ پہلی ملاقات کی یاد تازہ کرنے کے لئے بار بار بھائی اخلاق بھائی اخلاق کہہ رہی تھی۔ آفتاب کو ان واقعات کا علم نہ تھا اور اس سے بھی زیادہ وہ ان دونوں کی دلی کیفیات سے بے خبر تھا۔ ایک دفعہ جو اس نے اتفاقیہ اخلاق کی طرف دیکھا تو اخلاق کو اپنے خیالات میں گم دیکھ کر اُسے فطرتاً حیرت ہوئی اور وہ اُسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ گلنار آفتاب کی نظریں تاڑ گئی۔ بولی "بھائی اخلاق کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

اخلاق اس فقرے سے گویا اپنے خواب سے جاگ اٹھا۔

چائے کا دور ختم ہوا تو اخلاق نے رخصت ہونے کی پھر اجازت مانگی گلنار نے کہا "ایک منٹ اور ٹھہریئے میں پان لگا لاؤں۔ اخلاق کو اُس کے ہاتھ کا پان بہت اچھا لگتا تھا۔ چار برس پہلے اس کا خیال تھا کہ گھر میں اور کسی کو پان لگانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ اور پھر اس نے نہ جانے کیوں پان کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن گلنار کو اس بات کا علم کیسے ہو گیا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ باہر سے کسی نے آفتاب کو آواز دے لی ادھر آفتاب باہر گیا اور ادھر گلنار پان لے کر آ گئی۔ اخلاق نے طشتری میں سے پان اُٹھایا اور نہایت دبی زبان سے کہا "شکریہ!" اور لفظ شکریہ کہہ کر اچانک اُسے گلنار کا وہ فقرہ یاد آ گیا "مجھے آپ کی زبان سے شکریے کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے" اور یہ فقرہ یاد آتے ہی اس نے نظر اُٹھا کر گلنار کی طرف دیکھا۔ وہ نیچی نگاہیں کیے خاموش کھڑی تھی ہاتھ میں پانوں کی طشتری تھی جس میں اب بھی ایک پان رکھا تھا۔ اخلاق کو محسوس ہوا کہ گلنار کا طشتری والا ہاتھ کانپ رہا ہے۔

اس نے کہا "گلنار ——" پھر خود ہی چپ ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میری شادی گلنار سے ہو جاتی تو ہم دونوں کی زندگیاں اب سے کتنی مختلف ہوتیں۔

گلنار بدستور نیچی نظریں کیے ہوئے بولی اس کی آواز میں درد تھا اور مایوسی بھی۔

"میں آپ کے جذبات کو پہچانتی بھی ہوں اور ان کی قدر بھی کرتی ہوں۔ لیکن آپ اپنی بیوی کی طرف سے جو غفلت برتتے ہیں وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ آخر اس غریب کا کیا قصور ہے؟

بیوی کا ذکر سن کر اخلاق کو اپنی بدنصیبی کا احساس اور زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگا اور اس احساس کے ساتھ اس کے تصور میں اُس کی بیوی آگئی جسے گلنار کے مقابلہ میں دیکھ کر اخلاق کے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگ گئی اور اُسے ایک عجیب قسم کی وحشت سی ہونے لگی۔

گلنار نے اس کے چہرے سے شاید اس کے خیالات پڑھ لئے۔ بولی :—

"آپ کو شاید میری باتیں بُری معلوم ہوتی ہوں لیکن —"

اخلاق نے اُسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ فوراً ہی لجاجت آمیز لہجہ میں بول اٹھا "ان نصیحتوں کو رہنے دو گلنار۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دو کہ تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو"

گلنار نے جذبات سے خالی آواز میں جواب دیا۔

"پاگل نہ بنو۔ اب میں خود کچھ نہیں ہوں۔ میری ہستی آفتاب کی ہستی میں فنا ہو چکی ہے"

گلنار کے جواب سے اخلاق کی نظروں میں بیوی کا تصور اور زیادہ تیز ہو گیا اور تصور کے تیز ہونے سے دل کی آگ اور وحشت بھی تیز ہو گئی۔ اٹھا۔ گلنار کو مایوس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

———— ∴ ————

میں اُسے ہمیشہ چڑاتا رہتا کہ ہر امتحان میں رعایتی نمبروں سے
پاس کی جاتی ہے - ورنہ حقیقتاً فیل ہو جاتی ہے۔ شروع شروع
میں تو اس نے میری بات کی تردید کرنے کی کئی دفعہ کوشش کی
مگر میں ٹھہرا ایک حاضر جواب اور اس پہ طرہ یہ کہ علیگڈھ کالج کا
گریجویٹ - بھلا میرے آگے وہ کیا جیت سکتی تھی۔ آخر اُس نے
میری بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرنی ہی چھوڑ دی۔ جیسے
میں چچی سے کہتا کہ آمنہ کو تو آپ بیکار اسکول بھیجتی ہیں۔ یہ محنت
تو کچھ کرتی نہیں۔ ہر مرتبہ فیل ہو جاتی ہے۔ اُستانیاں رعایتی نمبر
دیتے دیتے تھک گئیں تو آمنہ مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ اس کے چپ ہونے
پر میں اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے کہتا۔ "چچی آجکل کی لڑکیاں تو بس
بناؤ سنگار میں لگی رہتی ہیں تعلیم کی طرف تو وہ ذرا بھی توجہ نہیں دیتیں"
آمنہ میری اس بات پر بھی نہ بولتی۔ حالانکہ جہاں تک اُس کا تعلق
تھا، یہ بات قطعی جھوٹ تھی۔ چچی ہنس کر کہتیں "اب تو تم بالکل سفید

جھوٹ بولنے لگے۔ ہماری آمنہ تو بہت سادگی پسند ہے۔ اسے تو بناؤ سنگار سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔"

میں جواب دیتا۔

"یہ رنگین کپڑے، یہ اونچی ایڑی کا جوتا۔ یہ بہتریں سرج کا کوٹ اسے آپ سادگی کہتی ہیں۔"

لیکن دراصل بات یہ تھی کہ آمنہ اپنی آرائش پر ذرا بھی وقت صرف نہ کرتی تھی۔ پھر اس نے خدا جانے کیوں رنگین کپڑے بھی پہننے چھوڑ دئے اور اونچی ایڑی کا جوتا بھی۔ البتہ کپڑے اُجلے ضرور رکھتی تھی سفید شلوار، سفید قمیص۔ سفید اوڑھنی اور سب بے داغ۔ مجال ہے کہ کسی پر ذرا سا دھبہ لگا ہو۔

میں جب بھی ان کے یہاں جاتا تو وہ کوشش کرتی کہ کسی بہانے سے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ لیکن میں پھر اُسے بلا لیتا۔ مثلاً مجھے دیکھ کر اگر وہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی تو میں چچی کے پاس ذرا سی دیر بیٹھ کر پینے کے لئے پانی مانگ لیتا اور چچی اُسے آواز دیتیں۔

"آمنہ بھائی کو پانی پلا جاؤ۔"

آمنہ سہمی ہوئی آتی اور شاید دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی پانی کا گلاس ہاتھ میں ہوتا اور نظریں زمین پر۔ میں پھر وہی ذکر چھیڑ دیتا۔ امتحان کا۔ لیکن وہ اسی طرح نیچی نظریں کئے خاموش کھڑی رہتی پہلے پیشانی پر جو بل نظر آتے تھے اب وہ بھی رخصت ہو گئے تھے۔

گو اُن کا مکان ہمارے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ لیکن میں ان کے یہاں دوسرے تیسرے دن جاتا۔ چچی ہمیشہ اس بات کی شکایت کرتیں

اور ان کی شکایت کا یہ اثر ہوا کہ میں تقریباً ہر روز جانے لگا۔ مگر نہ جانے مجھے آمنہ کو تنگ کرنے میں اور چڑانے میں کیوں مزا آتا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ جب وہ کسی بات کا جواب ہی نہ دیتی تھی اور یہاں تک کہ اُس کے لب سے تبسم اور پیشانی سے بل بھی رخصت ہو گئے تھے تو میں بار بار یہ بات کیوں کہتا رہا۔

وہ نویں جماعت میں تھی۔ ایک دن چچی نے مجھے بتلایا کہ اب تو آمنہ بہت رات تک پڑھتی رہتی ہے۔ میں نے ذرا بلند آواز سے جواب دیا تاکہ دوسرے کمرے میں آمنہ بھی میری بات سن سکے۔ حالانکہ چچی نے بات آہستہ سے کہی تھی۔

"یونہی آپ کو دکھانے کے لئے کتاب لیکر بیٹھ جاتی ہو گی۔ ورنہ یہ کیا پڑھے گی۔ پاس تو ہوتی ہے ہمیشہ رعایتی نمبروں سے۔"

بات یہ تھی کہ وہ آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان سے دو ایک مہینے پہلے بیمار ہو گئی تھی۔ اور بیمار بھی ایسی ہوئی تھی کہ پڑھنا لکھنا سب بھول گئی۔ اس لئے ایک آدھ مضمون میں فیل ہو گئی۔ لیکن چونکہ دوسرے امتحانوں میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتی رہی تھی۔ اس لئے ہیڈ ماسٹرنی نے اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اور رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا۔

اسی مذاق میں نویں جماعت کا سالانہ امتحان شروع ہو گیا۔

ایک دن جب وہ پرچہ دے کر آئی تو میں ان کے یہاں بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ سلام کر کے سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے کہا "آمنہ بھئی یہ تو میں جانتا ہوں کہ سوالوں کے

جواب تم نے خاک بھی نہ لکھے ہوں گے۔ لیکن مجھے پرچہ تو دکھا جاؤ۔ اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر چچی نے آواز دی "بھائی کو پرچہ دکھا جاؤ آمنہ بیٹا۔"

اُن کے لڑکا کوئی نہ تھا اور لڑکی بھی صرف ایک یہی تھی۔ اس لئے چچی اور چچا اُسے بیٹا ہی کہتے تھے۔

آمنہ آئی اسی طرح زمین پر نظریں جمائے۔ چہرہ جذبات سے یکسر خالی۔ نہ غصہ نہ خوشی۔ لیکن معمول سے زیادہ سرخ۔ میں نے اس سے پرچہ لیا ہی تھا کہ وہ ایک دم واپس چلی گئی اور جس دن وہ آخری پرچہ دے کر آئی اُس دن بھی میں اُس کے یہاں ہی بیٹھا تھا۔ اُس دن اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ دہلیز سے صحن میں قدم رکھتے ہی اُس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر آج میں نے اپنی بات دہرائی تو یہ رو پڑے گی لہٰذا میں چپ رہا۔ اور وہ حسب عادت سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی کچھ دیر کے بعد اُسے بلانے کے لئے میں نے شرارتاً کہا۔

"آمنہ آج کا ہے کا پرچہ تھا۔ آج بھی کچھ جواب لکھے کہ نہیں۔"

اُس کے جواب نہ دینے پر چچی بولیں "بھائی کو پرچہ دکھا جاؤ آمنہ بیٹا۔"

لیکن وہاں سے پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ چچی نے دوبارہ آواز دی تو تو اس نے کہا۔ "مجھے تو بخار ہو رہا ہے۔" اس کی آواز کچھ کپکپا سی رہی تھی۔ چچی اور میں ایک دم اُس کے کمرے میں گئے۔ وہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ چچی نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور میں نے کلائی تھام لی۔ اُس نے ایک دم گردن پھیر لی۔ جیسا کہ اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو بھر آئے تھے۔ اور انہیں چھپانے کے لئے اُس نے دوسری طرف رخ کر لیا تھا۔ میں نے چچی سے کہا اور بخار بہت تیز ہے۔ میرے خیال میں ابھی ڈاکٹر کو بُلا لینا چاہئے۔

پوچھنے کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ کئی دن سے بخار ہو رہا ہے۔ بخار ہی میں مدرسے امتحان دینے جاتی رہی اور بخار ہی میں رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے تک پڑھتی رہی اور یہ سب کیوں کیا — اس لئے کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے۔

اُس کی بیماری سے میں سب ہنسی مذاق بھول گیا۔ دن رات اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھا دوائیں دیتا رہتا اور دعائیں مانگتا رہتا۔ لیکن بخار اور تیز ہوتا گیا۔ پھر بخار کی تیزی سے اور شاید انگریزی گرم دواؤں سے سرسام ہو گیا۔

بیماری کے دوران میں ایک دن جب میں دروازے میں کھڑا تھرما میٹر ہاتھ میں لئے اس کے بخار کا درجۂ حرارت پڑھ رہا تھا۔ یہ سرسام ہونے سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ چچی باہر دودھ گرم کرنے گئی ہوئی تھیں آمنہ نے کہا "شوکت بھائی!" میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کیا آپ مجھے اتنا ہی حقیر سمجھتے ہیں جتنا کہ زبان سے کہتے ہیں" میں نہ جانے کیوں ہنس پڑا۔ وہ چپ ہو گئی اور ایک عجیب قسم کی مایوسی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ میں تھرما میٹر لے کر اس کے قریب گیا اور اس کے پلنگ کے بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں اُٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ .... اُس نے پھر پہلی طرف رخ کر لیا۔ میری ہنسی سے یقیناً اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور شاید اُن آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ میری طرف رخ کرنا نہ چاہتی تھی۔

میں نے پوچھا "لیکن آمنہ تمھارے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ میں تمھیں حقیر سمجھتا ہوں؟" اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسی طرح منہ موڑے خاموش لیٹی رہی۔ اور پھر اچانک مجھے کئی باتیں یاد آ گئیں۔ ایک روز میں ان کے یہاں

گیا تو چچی نے خوبصورت کڑھا ہوا میز پوش اور تکیے کا غلاف پیش کیا اور بولیں۔
"یہ آمنہ نے خاص طور پر تمھارے لئے کاڑھے ہیں" میں نے دونوں چیزیں ہاتھ میں لیں اور کھول کر دیکھیں۔ اور یہ کہتے ہوئے میز پر رکھ دیں "ابھی تو یہ بچی ہے ابھی اسے ان چیزوں کے کاڑھنے کا شعور کہاں۔ پھر ایک دن چچی نے کچھ سموسے اور کباب دیئے۔ میں نے ایک سموسہ اور ایک کباب چکھا اور پلیٹ یہ کہتے ہوئے واپس کر دی کہ یہ چیزیں آمنہ نے پکائی ہونگی جبھی بے مزہ ہیں۔ میں سوچ رہا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ اسی وقت آمنہ سے کہہ دوں کہ میں تمھیں دل میں ہرگز ایسا نہیں سمجھتا جیسا کہ زبان سے کہتا ہوں کہ اتنے میں چچی گرم دودھ لے کر آگئیں اور دوسرے دن آمنہ کو سرسام ہو گیا۔
اُن کے اسکول کی ہیڈ ماسٹرنی کو پتہ لگا تو وہ بھی عیادت کو آئیں۔ آمنہ بیہوش پڑی مانے کیا کیا بول رہی تھی۔ چچی نے گلوگیر آواز میں کہا
"بیٹا یہ ہیڈ ماسٹرنی تمھاری طبیعت پوچھ رہی ہیں"۔
لیکن آمنہ کو ہوش کہاں تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر ہیڈ ماسٹرنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُنھوں نے بتایا کہ پچھلے دو مہینوں میں آمنہ نے تعلیم میں حیرت انگیز ترقی کی تھی اور سالانہ امتحان میں تو کمال ہی کر دیا۔ صرف جماعت ہی میں اول پاس ہوئی۔ بلکہ ریکارڈ بھی قائم کیا ہے۔
لیکن وہ اپنے اتنے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے کی خبر نہ سن سکی۔

دسمبر کی پچیس تاریخ تھی اور جمعہ کا دن:

جگدیش کو ایک دوست سے ملنے جانا تھا۔ اس نے جی کڑا کر کے سائکل اُٹھائی اور چل دیا۔ سائکل چلانی اُس نے نئی نئی سیکھی تھی صرف دو چار دفعہ مشق کی تھی اور وہ بھی کشادہ اور کم سفر سڑکوں پر۔

یہ دہلی کا ذکر ہے اُس کا دوست موری گیٹ رہتا تھا اور وہ نئی دہلی۔ قطب روڈ تو خوب چوڑی ہے۔ اس پر کوئی ایسا بہت زیادہ ٹریفک بھی نہیں ہوتا۔ لہذا جگدیش آسانی سے چلتا رہا۔ لیکن جب مٹھائی کے پل کے قریب پہنچا تو اول تو چڑھائی پہ زور لگانا پڑا اور دوسرے ٹریموے کی لائنوں سے پہیوں کو مشکل سے بچایا۔ سڑک پر کیچڑ بھی ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک دن پہلے ہلکی سی بارش ہو چکی تھی خیر بچ بچا کر وہ پل پہ پہنچ گیا۔ لیکن پل پر پہنچا تو ایک دم پُشت سے کار کے ہارن کی آواز آئی اور سامنے سے ٹراموے آتی دکھائی دی اور دائیں ہاتھ سے ایک تانگہ آ رہا تھا جگدیش گھبرا گیا۔ تاہم اس نے حوصلہ نہیں ہارا اپنے انتہائی بائیں پر سائکل چلانے لگا۔ لیکن اس کے فکروں میں اضافہ کرنے کے لئے

اچانک ایک عورت، ایک نوجوان لڑکی اور ایک چھوٹا سا لڑکا دائیں جانب سے بائیں جانب آ گئے۔ جگدیش نے عورت سے تو سائکل بچالی۔ لیکن لڑکی سے بچائی ہی تھی کہ پہیہ لائن میں پھنسنے لگا۔ اس نے ایک دم ہینڈل گھمایا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ پہیہ لائن سے بچ کر لڑکی سے ٹکرا گیا۔ جگدیش نے فوراً اپنی ٹانگیں زمین پر ٹیک دیں اور دوسرے لمحہ نیچے اتر آیا۔ پہیہ گارے سے لت پت ہو رہا تھا۔ لڑکی کے ہرے رنگ کے اوورکوٹ پر جہاں پہیہ لگا گارا لگ گیا۔ لڑکی نے ایک تیز نظر جگدیش پر ڈالی اور حقارت اور غصہ سے بولی "ٹائی لگا کر چلے آتے ہیں۔ سائکل چلانی نہیں آتی۔" اور اس کی ماں نے کہا "آنکھیں نہیں ہیں منھ پر؟"

جگدیش کو لڑکی کے اوورکوٹ خراب ہونے کا افسوس ضرور تھا۔ مگر اس کے غصہ اور حقارت کے الفاظ نے اس کی خودی کو ابھارا۔ اگر لڑکی ایک لمحہ — ہاں صرف ایک لمحہ اور خاموش رہتی تو جگدیش اپنے کوٹ کے جیب سے اپنا ریشمی رومال نکال کر اس کے اوورکوٹ کا گارا صاف کرنے لگتا اور نہایت لجاجت سے معافی مانگتا۔ مگر وہ تو ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اور پھر اس کی ماں بھی بول پڑیں۔ لہٰذا جگدیش نے بھی اسی قسم کی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوورکوٹ پہن کر چلی آتی ہیں اور سڑک عبور کرنی نہیں آتی"

اور سائکل پر سوار ہو کر چلا گیا۔

لڑکی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ جگدیش کے منھ پر تڑاق سے ایک چانٹا رسید کر دے۔ مگر وہ تو جا چکا تھا۔

"کتنا بے ادب تھا وہ اور کتنا ڈھیٹ اور کتنا مغرور" لڑکی کا غصہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اور پھر اس کے چھوٹے بھائی نے گویا جلتی آگ پر مٹی کا تیل چھڑک دیا

"کوٹ تو بالکل خراب ہوگیا"

لڑکی نے اپنے سر کو ایک خاص انداز سے جنبش دی اور چل پڑی۔ چھوٹے بھائی کے فقرے نے اس کے غصہ کے جذبات اور زیادہ مشتعل کر دئے تھے۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اسے اس طرح ناراض کیا۔ اس کا کوٹ خراب کر دیا۔ اور نہ معافی مانگی نہ کوٹ صاف کرنے کی کوشش کی اور نفرت کی نظر ڈال کر چل دیا۔ اس کی یہ ساری حرکتیں لڑکی کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں اور بالکل عجیب۔ اس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں ذرا سی غلطی پر (I am sorry) کہا جاتا تھا۔ جہاں بات بات پر معافی مانگی جاتی تھی۔ کہاں یہ اتنی بڑی حماقت پر بھی جگدیش نے جھوٹے منہ سے افسوس کا اظہار نہ کیا۔ اسے حیرت تھی کہ کوٹ سوٹ پہننے والا نوجوان موجودہ زمانے کی تہذیب سے اتنا نابلد کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ صنفِ لطیف کا ادب نہ کرے یا اپنی غلطی پر افسوس ظاہر کر کے معافی کا خواستگار نہ ہو۔ پھر کیا اس نے جان بوجھ کر میری توہین کی ہے۔ کیا اس نے مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ دو چار لفظوں میں اپنی شرمندگی اور تاسف کا اظہار کر دے۔ اس میں میری کیا غلطی تھی۔ سڑک تو ہم عبور کر ہی چکے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں کیسا لاابالی پن تھا۔۔۔ بیہودہ اور مغرور۔ اے کاش میں نے فوراً زور سے اس کے گالوں پر ایک تھپڑ لگا دیا ہوتا۔

انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ اپنی کوٹھی پہنچ گئی۔ آج اسے پٹرول ختم ہونے پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اگر پٹرول کے کوپن ختم نہ ہو چکے ہوتے تو پیدل کیوں چلتے اور کیوں یہ ناگوار واقعہ پیش آتا۔ اسے کیا خبر تھی کہ پٹرول ہی نہ ہونے کی وجہ سے تو جگدیش نے سائکل چلانی سیکھی تھی۔ ورنہ پٹرول پر پابندی ہونے

پہلے وہ بھی کبھی موٹر کار سے نیچے پاؤں نہ اُتارتا تھا۔

کوٹھی پہنچ کر سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ برش لیکر کوٹ سے سوکھی ہوئی مٹی چھڑانے لگی۔ وہ اس ناخوشگوار واقعہ کی یادگار جلد سے جلد مٹا دینا چاہتی تھی۔ لیکن زور زور سے برش رگڑنے کے باوجود بھی دھبّہ نہ مٹا۔ اور جوں جوں وہ دھبّہ مٹانے میں ناکامیاب رہی اس کے دل میں دھبّہ لگانے والے کی طرف سے اتنی ہی زیادہ نفرت بڑھتی گئی۔ اور اتنا ہی زیادہ اُس کے گودی پن، حماقت اور بیہودگی پر غصّہ آتا رہا۔

پھر کئی دن وہ اپنی سہیلیوں سے اُس کی بے وقوفی اور جہالت کا ذکر کر کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی اور اسے دسیوں قسم کے ناموں سے یاد کرتی رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کے دل سے دھبّہ اور دھبّے والے کا خیال مٹنے لگا۔ اور مٹتے مٹتے تقریباً بالکل ہی مٹ گیا۔ پھر بھی وہ اس کے غرور اور اس کی حقارت کی نظر نہ بھلا سکی اور جب یہ دونوں چیزیں اُسے یاد آتیں تو اس کے دل میں نفرت کی ایک نئی لہر سی پیدا ہو جاتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔

پھر ایک دن اس کی ماں نے اس سے کہا کہ نیلا آج ذرا احتیاط سے کپڑے بدلنا کچھ مہمان آرہے ہیں۔ اس کے دل میں ماتاجی کی یہ بات کھٹکی۔ مہمان تو ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ لیکن ماتاجی نے پہلے کبھی ایسی ہدایت نہ کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کپڑے تو ہمیشہ ہی صاف رہتے تھے پھر انھیں تاکید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اُسے اپنے ماتا پتا کی پچھلے دو دن کی گفتگو کے کچھ فقرے یاد آگئے اور وہ مسکرا کے غسل خانہ میں چلی گئی۔

٭

آرائش سے فارغ ہو کر وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلی گئی اور "چاند" پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی ماں آئی اور نرمی سے بولی "لیلا، مہمان آگئے ہیں۔ میں اُن کے پاس جاتی ہوں۔ تم ذرا چائے لیکر آجانا۔"

ماں کی بات پر ایک مرتبہ اور اُسے تعجب ہوا۔ جب کوئی مہمان آتا تھا تو روزمرہ کی طرح چائے لانے کی خدمت ہمیشہ نوکر انجام دیتا تھا۔ آج ایسا کون مہمان ہے کہ لیلا کو چائے لانے کے لئے کہا گیا۔ اُس کے جی میں آیا کہ انکار کر دے مگر ان کی نظر دیکھ کر چپ ہو گئی۔

جب وہ چائے کی ٹرے لیکر کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ اس کی ماتا کی عمر کی ایک بشاش چہرے والی عورت کرسی پر بیٹھی ہے اور اس کے برابر ایک نوجوان بیٹھا ہے۔ اس عورت کے بالمقابل اُس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ دروازے کی طرف نوجوان کی پشت تھی اس لئے لیلا اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ وہ نہایت بھنچے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اُن کے قریب گئی اور میز پر ٹرے رکھکر ادب سے عورت کو نمستے کیا۔ اور اُنھیں نمستے کر کے جو اس نے نوجوان کی جانب دیکھا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ ایک دم اُس کے جی میں آیا کہ ٹرے اُٹھا کر واپس چلی جائے اور جاتی جاتی کہہ جائے کہ ایسے بدتہذیبوں کے لئے اُس کے یہاں نہ چائے ہے اور نہ جگہ۔ لیکن ابھی وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی ماں نے کہا "اُنھیں بھی نمستے کرو لیلا" ماں کے حکم کی تعمیل میں لیکن بادلِ ناخواستہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور پیشانی تک لیجا کر چھوڑ دیئے۔ پھر اس کی ماں نے کہا "بیٹھ جاؤ" صرف ایک کرسی خالی تھی۔ نوجوان کے مقابل والی۔ لیلا کو اسی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ لیکن اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بدتمیز سے کوئی بات نہ کرے گی۔ وہ مجبور تھی۔ ماتا پتا کی

عزت کا پاس اُسے مجبور کر رہا تھا۔ ورنہ نوکر کو حکم دے کر اس نوجوان کو فوراً کوٹھی سے باہر نکلوا دیتی۔ پُل والا سارا واقعہ اس کی نظروں میں پھر گیا تھا اور واقعہ کے ساتھ نوجوان کا عذر اور بدتہذیبی بھی یاد آگئی تھی

ماں کے کہنے سے وہ چائے بنانے لگی۔ سب سے پہلے اُس نے نوجوان کی ماں کی پیالی میں شکر کے دو چمچے ڈالے۔ نوجوان بولا چائے بناتے وقت شکر کا صرف ایک چمچہ ڈالنا چاہئے۔ اگر کوئی زیادہ شکر ڈالنے کا عادی ہو تو وہ بعد میں اور لے سکتا ہے۔ لیلا نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور جب اُس کی پیالی میں شکر ڈالی تو بھی دو ہی چمچے ڈالے۔ اس کی ماتا بولیں "ان کے پاس تو ایک چمچہ ڈالنا تھا" لیکن وہ جب بھی کچھ نہ بولی۔

پھر چائے پینے کے دوران میں نوجوان نے کئی دفعہ کوشش کی کہ لیلا سے بات گفتگو کرے۔ لیکن ہر دفعہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور کئی مرتبہ لیلا کی ماں کو کہنا پڑتا کہ یہ بہت ہی شرمیلی ہے۔ میں ہر چند سمجھاتی رہتی ہوں کہ اتنی بے جا شرم و حیا اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ اور ساتھ ہی لیلا سے بھی کہتیں "جواب کیوں نہیں دیتی یہ کیا پوچھ رہے ہیں" لیکن لیلا اُسی طرح نظریں جھکائے خاموش بیٹھی چائے پیتی رہی۔

جگدیش کوئی بے وقوف تو تھا نہیں کہ لیلا کی ماں کی بات کو سچ مان لیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جو لڑکی ایک اجنبی پر ناراض ہو کر اس کی ٹائی پیدیا یا میسکل چلانے پر نکتہ چینی کر سکتی ہے وہ کتنی شرمیلی ہو سکتی ہے۔ بہر حال وہ اس سے سوال کرتا رہا اور اس کی ماں اس کی طرف سے جواب دیتی رہی۔

جب وہ ماں بیٹے چلے گئے تو لیلا کی ماں اُس پر بہت ناراض ہوئیں۔ "آخر آج تجھے کیا ہو گیا تھا۔ تو یوں گونگے کا گڑ کھا کر کیوں بیٹھ گئی تھی"

لیلا نے جواب دیا" ماتا جی آپ نے اس لڑکے کو نہیں پہچانا — یہ تو وہی بدتمیز تھا جس نے مٹھائی کے پل پر میرا اوورکوٹ خراب کر دیا تھا۔"

اور اُس کی ماں نے چڑھ کر کہا " تو نے تو آج بڑی تمیز کا ثبوت دیا ہے!"

⁂

جگدیش کی ماں کو لیلا بہت پسند آئی۔ خاص طور پر اُس کا خاموش رہنا تو انھیں بہت ہی پسند آیا۔ اور اس کی یہ سادگی تو ان کے دل ہی میں اتر گئی کہ جگدیش نے گو ہدایت کر دی تھی کہ چائے کی پیالی میں شکر کا ایک چمچہ ڈالنا چاہیے۔ لیکن اس نے جگدیش کی پیالی میں بھی دو ہی چمچے شکر ڈالی۔

اور جگدیش کو تو گویا ضد ہو گئی تھی کہ شادی کرنی ہے تو لیلا سے نہیں تو کنوارے ہی سہی۔

لہٰذا ان کے یہاں سے پیغام گیا۔ ادھر لیلا کے ماں باپ بھی ہر طرح سے اپنا اطمینان کر چکے تھے۔ انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ لیکن لڑکی کی رضامندی لینی بھی ضروری تھی۔ اور لیلا راضی نہ ہوتی تھی، اس نے دبے الفاظ سے کہہ دیا تھا کہ ایسے بدتمیز اور مغرور سے میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔ ماں باپ نے اور زور دیا تو خاموش ہو گئی۔ غریب ہندوستانی لڑکی ماں باپ کے حکم کے آگے سر جھکانا ہی جانتی ہے۔ سرکشی کرنا نہیں جانتی۔

⁂

شادی کی پہلی رات وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گردن جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آج شب ان سے کیا گفتگو کی جائے۔ اتنے دن کے سوچ بچار کے بعد اُس نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ اُس کے دل میں جگدیش کی طرف سے جو نفرت تھی

وہ صرف نفرت نہ تھی بلکہ محبت کی ایک صورت تھی اور اب تو دراصل وہ اپنے دل میں اُس کے لئے کچھ بہت ہی زیادہ محبت محسوس کرنے لگی تھی۔

پھر بھی آج وہ اُسے سائکل والے معاملے کے متعلق سبق دینا چاہتی تھی خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ماتا پتا کا حکم میں نے مان لیا۔ اب اگر یہ ٹھیک ہو گئے اور ایک دفعہ —— ہاں صرف ایک دفعہ اُس دن کے واقعہ پر اظہارِ ندامت کر دیا تو بہت اچھا۔ اور اگر پر ماتما نہ کرے انھوں نے پھر اُسی غرور اور جہالت سے کام لیا تو —— تو آج وہ اپنی تمام خوشیوں کی بازی لگا رہی تھی۔ اور شکست کے خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔

سہیلیاں مذاق کرنے لگیں۔ کس سوچ میں بیٹھی ہو۔ تھوڑی سی دیر اور باقی ہے۔ پھر وہ آہی جائیں گے۔ آج تو تمھیں ہمارا پاس بیٹھنا بھی ناگوار گزر رہا ہو گا۔ اس دن کوٹ پر دھبہ لگانے پر تو اتنی بگڑی تھیں آج دیکھیں —— اُس نے ان میں سے کسی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ اپنے بالکل پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کے پہلو میں زور سے چٹکی لے لی۔ وہ لڑکی پھدکتے ہوئے بولی "بہن چٹکیاں لے لے کر کیوں بھگاتی ہو۔ ہم تو خود ہی چلے جاتے ہیں اور اٹھ کر چل دی۔ اور اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ یہ آہستہ آہستہ بلاتی بھی رہی۔ مگر کوئی نہ آئی۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی قدموں کی چاپ کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ جگدیش بغل میں ایک بڑا سا پیکٹ لئے کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر وہی شریر اور پر غرور تبسم کھیل رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر سیدھا اُس کے پاس آ کر پیکٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں آگے کو بڑھاتے ہوئے بولا:۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ اس روز میری غلطی سے آپ کا اوورکوٹ خراب ہو گیا تھا۔ اس کے بدلے میں یہ اوورکوٹ پیش کرتا ہوں ـــــ"
لیلا کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو بھر آئے۔

رام پرشاد جی صبح سے ایک ٹانگ کے بل پھر رہے تھے۔ گاؤں سے ایک چھوڑ دو بیٹے تھے اور ملازموں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کے علاوہ رشتہ دار بھی بہت سے آئے ہوئے تھے۔ جو نہایت خوشی سے ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن رام پرشاد جی ہر کام اپنی خاص نگرانی میں ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس لئے صبح سے انھیں آرام کرنے یا کچھ دیر بیٹھ کر سستانے کی فرصت نہ ملی تھی اور اس کا انھیں ذرا بھی خیال نہ تھا۔ کیونکہ یہ ان کی لاڈلی بیٹی سرلا کے بیاہ کا دن تھا۔ سرلا سے رام پرشاد جی کو بے انتہا محبت تھی۔ سرلا کو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں سے زیادہ ناز و نعمت سے پالا تھا اور پھر تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں بھی انھوں نے کوئی کمی نہ اٹھا رکھی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس نے اسکول میں بھی تعلیم پائی اور کالج میں بھی۔ لیکن مغربی بیہودگیوں سے رام پرشاد نے اسے نہایت سختی کے ساتھ الگ رکھا۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ سرلا جوان ہو کر نہایت عقلمند، خلیق، ملنسار، نیک طینت، ماں باپ کی مطیع اور بھائیوں کی فرمانبردار لڑکی بن گئی تھی۔ رام پرشاد جی نے اس کے لئے بر کی تلاش میں

نہایت احتیاط سے کام لیا - دسیوں لڑکوں پر نظر گئی - لیکن چھان بین اور غور و خوض کے بعد انھیں رد کر دیا گیا - آخر قریب کے ضلع کے ایک وکیل کا لڑکا انھیں پسند آ ہی گیا - اور پسند آنے پر انھوں نے بہت زیادہ تزک و احتشام کے ساتھ اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں - لیکن جیسے جیسے شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا، سرلا سے جدا ہونے کا غم انھیں بیتاب کر رہا تھا اور آخر وہ وقت آ ہی پہنچا جس کا رام پرشاد جی کئے ہوئے دل سے انتظار کر رہے تھے - اب ان پر صحیح معنوں میں اس بات کی حقیقت کھلی تھی کہ لڑکی دوسرے کی امانت ہوتی ہے - ماں باپ کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسکی نہایت احتیاط سے پرورش کرے اور جب وہ دوسرے کے گھر جانے کے قابل ہو جائے تو یہ امانت - یہ قابلِ قدر اور خوبصورت امانت دوسرے کے سپرد کر دی جائے۔

بارات کو نہایت پر تکلف اور قسم قسم کے کھانے اور مٹھائی دی گئی - ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر رام پرشاد جی ذرا دیر کو لیٹ گئے - کچھ تھک گئے تھے اور کچھ اس بات کے احساس نے کہ سرلا کل چلی جائے گی - انھیں بے حال سا کر دیا تھا - پنڈتوں نے لگن دیکھ کر پھیروں کا وقت صبح تین بجے کا مقرر کیا تھا - رام پرشاد جی کو لیٹے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوئے تھے کہ لڑکے والوں کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ رام پرشاد جی کو نوشہ بلا رہا ہے — رام پرشاد جی کے بیٹے بولے کہ لالہ جی تو سو رہے ہیں - چلیے ہم چلتے ہیں - لیکن آدمی نے جواب دیا "مجھے تو نوشہ نے یہ کہا تھا کہ لالہ رام پرشاد جی کو بلا کر لانا۔"

بیٹوں نے کہا "بھئی ان کی تو آنکھ لگ گئی ہے - اس میں کیا حرج ہے اگر ہم میں سے کوئی جا کر پوچھ آئے کہ کیا بات ہے - لہٰذا بڑا بھائی اس آدمی کے ساتھ چلا گیا - دولہا نے کہا مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ لالہ جی ہی سے کہنا ہے - اس نے

آپ مہربانی کر کے انھیں کو یہاں بھیج دیں۔ سرلا کے بھائی صاحب نے ہر چند کہا کہ آپ مجھے انھیں کی جگہہ سمجھئے اور جو کچھ کہنا ہے بے تکلف کہہ دیجئے۔ لیکن نوشہ نہ مانا۔ آخر اس نے آکر اپنے چھوٹے بھائی سے ساری بات بتادی اور دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے اپنے پتا کو جگا دیا۔ رام پرشاد جی بہت حیران ہوئے کہ نوشہ کی مرضی کے خلاف کیا بات ہوئی۔ جو اس نے مجھے اس وقت بلایا ——خیر اُٹھے اور جا کر پوچھا کیا بات ہے بیٹا۔ کیا تمھیں کوئی تکلیف پہنچی یا تمھاری مرضی کے خلاف کوئی کام ہوا؟"

دولھا نے کہا" دیکھئے بات یہ ہے کہ مجھے ایک موٹر کار کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے ایسے رشتے مل رہے تھے جن میں لڑکی والے جہیز میں کار دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ بھی سیٹھ آدمی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ آپ کے یہاں سے بھی کار مل ہی جائے گی۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کار نہیں دے رہے ہیں۔ اس لئے مجھے آپ کو اس بے وقت تکلیف دینی پڑی۔ لہٰذا اگر آپ ایک فرسٹ کلاس موٹر کار اور پانچ ہزار روپیہ نقد دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو پھیرے ہوں گے۔ ورنہ ہملوگ اسی طرح واپس چلے جائیں گے۔"

دولھا کی بات رام پرشاد جی کو بہت ناگوار گزری۔ انھیں ایک دم غصہ آگیا اُن کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ جس لڑکے کو وہ اپنی پیاری بیٹی سرلا کیلئے انتخاب کر رہے ہیں وہ اتنا کمینہ اور اتنا گرا ہوا ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ بوڑھے آدمی تھے۔ نہایت دُور اندیش اور نہایت عقلمند۔ اس لئے ضبط کر کے بولے۔

"جو کچھ آپ نے کہا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ اور کوشش کروں گا کہ اس کو حرف بحرف پورا کر دیا کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی سوچئے کہ اس وقت جو ہم اور چیزیں دے رہے ہیں وہ کیا کم ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکی والوں کے سر سے

تو کبھی بوجھ اترتا ہی نہیں۔ ابھی اور موقعے آئیں گے تو کسی مناسب موقع پہ ہم آپ کو کار بھی لے دیں گے۔"

لیکن لونشہ نے تو پہلے ہی اپنے دل میں اس سب باتوں کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ بولا:۔

"آیندہ آپ کچھ دیں یا نہ دیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں لیکن آج پھیرے اس وقت ہوں گے جب کم سے کم دس ہزار روپیہ کا چک میرے پاس پہنچ جائیگا۔ کیونکہ پانچ ہزار سے کم میں اچھی کار نہیں آسکتی۔"

رام پرشاد جی کو اس کا یہ جواب اور بھی ناگوار گزرا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شاید اس کے دو چار چپت رسید کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ لیکن موقع ہی نازک تھا۔ ان کی عزت خطرے میں تھی اور اپنی عزت کو خطرے میں سے نکالنے کیلئے وہ ہر قربانی دینے کو آمادہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے ایک دفعہ اور اُسے نرمی سے سمجھایا۔ اور پھر جب وہ اس پر بھی نہ مانا تو انھوں نے کہا "اچھا وکیل صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان سے بھی تو بات کر لینے دو۔"

لڑکا نہایت ہی ڈھیٹ تھا کہنے لگا "لالہ جی پھیرے مجھے کرنے ہیں یا وکیل صاحب کو۔ آپ اُن سے بات کرتے ہیں تو شوق سے کر لیجئے۔ لیکن ہوگا وہی جو میں نے کہا ہے۔"

رام پرشاد جی نے ایک مرتبہ اور ضبط سے کام لیا اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے کہ اچھا میں جا کر اپنے لڑکوں سے مشورہ کر لوں۔"

لونشہ نے کہا۔ "لیکن ایک گھنٹے میں مجھے کوئی حتمی جواب بھیج دیجئے گا۔"

جب یہ واپس پہنچے تو دونوں بیٹے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ لالہ جی نے انھیں من و عن ساری بات کہہ سنائی۔ وہ دونوں بھی دولھا کی پیش کردہ شرط پر بہت

آزردہ ہوئے۔ لیکن صرف آزردہ ہونے سے کام نہ چل سکتا تھا۔ وہاں تو عزت کا سوال درپیش تھا۔ انھیں رنج اس بات کا تھا کہ جب وہ خود بیس بائیس ہزار روپے کا ساز وسامان اور زیور وغیرہ دے رہے ہیں تو دولھا نے دس ہزار کی اور شرط پیش کیوں کی۔ جو شخص اپنی لڑکی کے جہیز میں بیس ہزار روپے خرچ کر سکتا ہے وہ دس ہزار روپے اور بھی دے سکتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے مجبور کیوں کیا جائے۔ اسے دھمکی کیوں دی جائے۔ ایسی شرط کیوں پیش کی جائے جس کے تصور ہی سے اس کے دل میں غم وغصہ کی آگ بھڑک اُٹھے۔ لالہ جی کی مرضی تھی کہ دولھا کا منھ مجلس دیا جائے۔ اس وقت جو وہ مانگتا ہے وہ دیا جائے۔ لڑکے کہتے تھے کہ ہمیں اس میں تو اعتراض نہیں۔ جو کچھ ہے آپ کا ہے۔ اگر آپ دس ہزار کی بجائے سرلا کو چالیس ہزار اور دیدیں تو بھی ہمیں بُرا معلوم نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح ایک بُری رسم کی بنیاد پڑ جائے گی۔ ہر لڑکا پھیروں کے وقت ایسی کڑی شرطیں پیش کرنے لگے گا۔ آپ کے پاس تو روپیہ ہے آپ دیدیں گے۔ لیکن غریب لوگ کہاں سے دیں گے۔ یہ تو اس نے ایسی بڑی بات کی ہے کہ اس کی ہمت افزائی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ رام پرشاد جی کو اپنے لڑکوں پر پورا پورا اعتماد تھا اور ان کے خلوصِ نیت پر بھی شبہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ اس وقت معاملہ کو طول نہ دینا چاہیے۔ اگر پرماتما نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو سرلا اپنے دل میں کیا کہے گی۔ کہ پتا جی نے دس ہزار روپے کی خاطر اس کا سہاگ خاک میں ملا دیا اور اُن کی اپنی ناک بھی تو کٹتی ہے۔ برادری والے کیا کہیں گے اور پھر دنیا کیا کہے گی۔ اس کے علاوہ دوبارہ لڑکے کی تلاش کرنی ہوگی۔ آجکل اچھے لڑکے مشکل سے ملتے ہیں۔ ہر تعلیم یافتہ لڑکے نے اپنے ہونے والے خسر سے کچھ نہ کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں۔ ایسی امیدیں جنھیں وہ خود یا اُن کے

ماں باپ پورا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ ان امیدوں کو وہ اپنی بیوی اور اس کے ماتا پتا کے اخراجات پر پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کی امیدیں ہوتی بھی ہیں نامناسب۔

باپ کی نیت دیکھی تو چھوٹے لڑکے کے بھی جی میں یہی آیا کہ دس ہزار روپے میں اگر عزت اور ناک بچتی ہے تو بچا لینی چاہئے۔ اس کے نزدیک غلطی اُن کی اپنی تھی کہ انھوں نے غلط لڑکے کو انتخاب کیا۔ لیکن بڑا لڑکا بولا۔ کہ اگر آپ اجازت دیں تو دو چار بزرگ رشتہ دار جو مہمان آئے ہوئے ہیں انھیں بھی بلا لیا جائے۔ شاید ان کے مشورے سے اس مشکل کا کوئی بہت ہی مناسب حل سمجھ میں آجائے۔ سیٹھ صاحب اس پر راضی ہوگئے۔

لہٰذا سب عمر رسیدہ رشتہ داروں کو بلا کر اُن کے سامنے سارا واقعہ بیان کردیا۔ اُن میں سے بھی اکثر نے یہی کہا کہ آپ کی لڑکی ہے۔ آپ خواہ اُسے کچھ دیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن نوشہ کا یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے اور اُس پر یہ دھمکی کہ اگر مطالبہ منظور نہ ہوا تو پھیروں سے انکار کر دے گا۔ اگر آپ نے اِس وقت اس کی یہ شرط مان لی تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ نے ایک بہت ہی بُری مثال قائم کر دی۔ آیندہ غریب لوگوں کو لڑکیوں کی شادی کرنے میں یہ مشکلیں بھی پیش آیا کریں گی۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوا کرے گی کہ دولہا کس چیز کی فرمائش کر دے۔ اور اس بات کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دے گا۔ خیال کیجئے کہ لڑکی کے ماں باپ جس قدر پھیروں کا وقت قریب آرہا ہے بیچارے متفکر ہوتے جارہے ہیں کہ خبر نہیں دولہا کس بات کا مطالبہ کر دے اور اس مطالبہ کو پورا بھی کرسکیں گے کہ نہیں۔

دو ایک کی رائے تھی کہ جہیز میں سے دس ہزار کی چیزیں کم کر دی جائیں اور اُن کی بجائے دس ہزار روپئے کا چیک دے دیا جائے۔

رام پرشاد جی نے پہلے تو گردن پھیر پھیر کر سب کو غور سے دیکھا۔ شاید

اطمینان کر رہے تھے کہ باراتیوں میں سے تو وہاں کوئی موجود نہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ اُن کی آواز غم و غصہ اور فکر سے بھاری ہو رہی تھی ۔

"جو کچھ آپ لوگوں نے کہا ہے وہ سب سچ ہے۔ لیکن آپ اس سارے معاملہ کو میری نظر سے دیکھئے۔ آپ میرے جذبات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ بُرا ہے۔ دولھا کی فرمائش اور فرمائش کرنے کا طریقہ سب کچھ بُرا ہے۔ میں شاید کبھی اس کی شکل بھی دیکھنے کا روادار نہ ہوں لیکن وقت کی نزاکت کا احساس بھی تو کیجئے۔ کیا آپ لوگوں کے نزدیک میری عزت خطرے میں نہیں ہے۔ کیا آپ لوگوں کے نزدیک اگر میں نے دولھا کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا تو میری ناک نہ کٹ جائیگی ۔ اور ان سب باتوں سے زیادہ کیا سرلا میری اس حرکت پہ مجھے معاف کر دیگی۔ کیا اُسے اس بات کا رنج نہ ہوگا کہ اس کے پتا نے دس ہزار روپے کی لالچ میں اس کا سہاگ بستے بستے اُجاڑ دیا"

وہ نہایت جوش کے ساتھ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کا پوتا آیا اور بولا۔

"داداجی بوا بلا رہی ہیں"

نوشے کی شرط کے متعلق عورتوں میں بھی خبر پہنچ گئی تھی اور عورتوں سے سرلا کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ رام پرشاد جی جب سرلا کے کمرے میں داخل ہوئے تو اُس کی سکھیاں ادب کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ سرلا نے اپنے پتا کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی :-

"پتاجی! مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے آپ کی اور بھائیوں کی نیت اور عادت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لئے مجھے خوف ہو چکا ہے کہ کہیں آپ اُن کی شرط نہ مان لیں"

رام پرشاد جی نے نہایت پریم سے جواب دیا :-

"لیکن بیٹا ان حالات میں یہی درست ہے کہ اس وقت اس نالائق کی بات مان ہی لی جائے۔" وہ خوش تھے کہ ان کی تربیت بہت اچھی رہی اور لڑکی نے ناجائز شرم وحیا سے کام نہیں لیا۔ جس بات سے خود اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی خوشیاں وابستہ تھیں۔ اس میں اُس نے بہت اچھا کیا کہ اپنی زبان کھولی۔

سرلا نے کہا: "پتا جی! آپ کے سامنے زبان کھولنا ہے تو بے ادبی۔ لیکن میرے خیال میں تو آپ اُن لوگوں کو یہاں سے اسی وقت نکلوا دیجئے۔ اور انھیں کوئی بھی سہولت بہم نہ پہنچائیے۔ وہ خود اپنے لئے گاڑیوں وغیرہ کا انتظام کریں یا جس طرح بھی جا سکتے ہوں اسی وقت چلے جائیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل میں میری محبت غالب آ رہی ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ میں وہاں کبھی خوش نہ رہ سکوں گی۔ اس وقت اگر آپ نے ان کی یہ شرط مان لی تو دو چار مہینے میں وہ مجھے پھر آپ کے یہاں چھوڑ جائیں گے کہ اگر آپ پانچ ہزار روپے فلاں کام کے لئے دیتے ہیں تو میں اسے لے جاتا ہوں نہیں آپ اپنے یہاں رکھئے۔ اور یہ بات پھر اسی طرح جاری رہے گی۔ دو چار مہینوں کے وقفوں کے بعد وہ ایسا کرتے رہیں گے۔ اور پھر یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

سرلا کی باتیں سُن کر رام پرشاد جی کی آنکھیں سی کھُل گئیں۔ جو کام رشتہ داروں کی نصیحتوں اور بیٹوں کی درخواستوں سے نہ ہو سکا تھا وہ سرلا کی باتوں نے ایک سکنڈ میں کر دیا۔ اس کے علاوہ ہونے والے داماد کی باتیں سن کر ان کے دل کو جو رنج پہنچا تھا وہ بھی سرلا کی باتوں سے یکلخت کافور ہو گیا اور اس کی جگہ ایک اطمینان اور خوشی نے لے لی۔ انھیں اس بات کے احساس سے اور زیادہ مسرت تھی کہ انھوں نے سرلا کی تعلیم پر جو روپیہ خرچ کیا تھا وہ بیکار نہیں گیا۔ بلکہ تعلیم نے اس کی جبلی خوبیوں کو اور زیادہ اُجاگر کر دیا تھا۔ خاص طور پر سرلا کی یہ بات

تو اُن کے دل میں اُتر گئی تھی کہ دو چار مہینے میں وہ پھر مجھے آپ کے یہاں چھوڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ فلاں کام کیلئے اگر آپ پانچ ہزار روپے دیتے ہیں تو میں لے جاتا ہوں۔ نہیں تو آپ اِسے اپنے ہاں رکھئے۔ اور پھر یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

لہٰذا انھوں نے جاکر سب رشتہ داروں کو بتا دیا کہ مجھے آپ لوگوں کی رائے سے اتفاق ہے اور ان میں یہی طے پایا کہ بارات کو ابھی ابھی شہر سے باہر نکال دینا چاہئے۔ اب انھوں نے نوجوانوں کو بھی بلا لیا۔ جو دوسری طرف تاش وغیرہ کھیلنے میں مشغول تھے۔ ایک بوڑھے آدمی نے ان نوجوانوں کو نہایت جوشیلی مگر مختصر تقریر میں بتایا کہ کیا ہوگیا ہے اور اب کیا کرنا چاہئے؟ لہٰذا سب کے سب لاٹھیاں لے لیکر چڑھ گئے اور دولھا سے جاکر کہا کہ بارات لیکر ابھی شہر سے باہر نکل جاؤ ورنہ ہم تمھاری ہڈی پسلی ایک کردیں گے۔

دولھا نے یہ دیکھا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ منتیں کرنے لگا کہ مجھے معاف کردیجئے مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اور اس کے باپ نے بھی بہت خوشامد کی کہ یہ تو نالائق ہے جو ایسی بات زبان پر لایا۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اتنا جوش آچکا تھا کہ انھوں نے ایک نہ سنی اور انھیں اسی وقت نکال کر دم لیا۔

اِس واقعہ کو ایک مہینہ نہ گزرنے پایا تھا کہ سرلا کیلئے ایک اور نہایت اچھے اور اونچے خاندان سے پیغام آگیا۔ اور جس ناک کے کٹنے سے رام پرشاد جی ڈرتے تھے وہ بڑی اور اونچی ہوگئی۔

—— ⁖ ——

محدود

اختر نیشنل گارڈ کی پریڈ دیکھنے گیا تھا۔ لیکن دیر میں پہنچا تھا۔ اس لئے بڑے لیڈر صاحب کے تو درشن نہ ہو سکے۔ وہ تو پہلے ہی سلامی لیکر چلے گئے تھے۔ البتہ اس وقت بھی مختلف صوبوں کے گارڈ کے ارکان اپنے اپنے کرتبوں کے مظاہرے کر رہے تھے۔ اختر بھی ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ بنارس کے گارڈ کے دو رکن چاقوؤں کی لڑائی کے کرتب دکھا رہے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر کیلئے بظاہر ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے تھے اور اس تیزی سے چاقو چلا رہے تھے کہ نظر بھی ان کے چاقوؤں کا اور ان کے ہاتھوں کی حرکتوں کا تعاقب نہ کر سکتی تھی۔ اختر بڑے انہماک سے یہ لڑائی دیکھ رہا تھا کہ کسی نے عقب سے آکر اس کے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے گردن پھیر کر دیکھا شوکت کھڑا مسکرا رہا تھا۔

جونہی اُس نے گردن پھیری شوکت نے پوچھا کہئے مزاج تو اچھے ہیں۔

شوکت اختر کو کئی مہینوں کے بعد ملا تھا اس لئے اختر نے اُس کے استفسار کا جواب دیئے بغیر خود اس سے سوال کر دیا "اتنے دن سے کہاں تھے آپ؟"

تھوڑی سی مزاج پرسی کے بعد دونوں دوست گارڈ کے ارکان کے کرتب دیکھنے لگے۔ دہلی نیشنل گارڈ کے سالار ایک چھوٹی سی چبوتری پر کھڑا بلند آواز سے داد دے رہا تھا اور بعض دفعہ ایسے دلچسپ فقرے کہہ جاتا تھا کہ بے اختیار سب کو ہنسی آ جاتی تھی۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو شوکت نے پوچھا "کیئے آپ نے کسی جلسہ میں بھی شرکت کی؟"

"جی ہاں پہلے دن تو خوب لطف آیا تھا"

"آج رات کو بھی آیئے گا نا"

"ضرور"

"بھئی میں نے ہر چند کوشش کی کہ شامل ہو سکوں مگر مجبوریوں کا بُرا ہو کہ آ ہی نہ سکا۔ آج بھی بڑی مشکل سے آیا ہوں"

دونوں دوست چاندنی چوک چلے گئے کیونکہ وہاں سے شوکت کو کچھ چیزیں خریدنا تھیں اور درزی سے سوٹ بھی لینا تھا۔ رستے میں ایک رسٹوران آیا۔ اختر نے کہا "آیئے کچھ پی چلیں پیاس لگ رہی ہے"

اور ابھی گلاسوں کے پانی ختم نہ ہوئے تھے کہ شوکت نے جیب سے نوٹ نکال کر گلاس لانے والے لڑکے کو دیا اور بولا .... "باقی پیسے لے آؤ"

اختر نے کہا "نہیں نہیں شوکت صاحب یہ نہیں ہوگا۔ پیسے میں دونگا"

"بھئی اس میں کیا فرق ہے؟ میں نے دیئے یا آپ نے"

لیکن اختر نہیں مانا اور اپنی بات پر مصر رہا۔ شوکت نے کہا "بات یہ ہے اختر صاحب کہ آپ کی آمدنی محدود ہے پھر یہ مہنگی کا زمانہ۔ اور مجھ پر تو آجکل خدا کا فضل ہو رہا ہے"

شوکت نے یہ بات حسن نیت سے کہی تھی لیکن پھر بھی اختر کے دل میں تیر بن کر لگی۔ اپنی محدود آمدنی کی "کوتاہی" پر بہت دفعہ اُسے افسوس ہوا تھا۔ لیکن شاید اتنا زیادہ کبھی نہ ہوا تھا جتنا کہ شوکت کی بات سن کر ہوا۔ اُسے رنج ہوا کہ شوکت مجھے رحم کے قابل کیوں سمجھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مجھے فضول خرچی سے بچنا چاہیے۔ لیکن یہ فضول خرچی تو ہرگز نہ تھی۔ آخر میں اتنا بھی تو گیا گزرا نہیں کہ ایک دوست کیلئے چند آنے بھی خرچ نہ کر سکوں تاہم وہ خاموش ہو گیا۔

پھر چیزوں کی خرید و فروخت سے جب فرصت ملی تو کھانے کا وقت ہو گیا تھا اور ادھر جلسہ کا وقت بھی قریب ہی تھا۔ اختر نے کہا۔ آئیے اب گھر چلیں وہاں سے کھانا کھا کر جلسہ گاہ پہنچ جائیں گے۔ لیکن شوکت نے اپنے ہاتھ کی گھڑی روشنی میں دیکھتے ہوئے جواب دیا "گھر جانے میں تو دیر لگے گی اور پھر وہاں کھانا صرف آپ کیلئے پکا ہو گا کیونکہ انھیں میرے آنے کی تو خبر ہی نہیں ہے۔ اس لئے میرے خیال میں تو یہ بہتر ہے کہ ہوٹل میں کھانا کھا کر جلسہ میں چلے چلیں"

کھانا کھاتے ہوئے بھی اختر کو اپنی محدود آمدنی کا خیال آتا رہا۔ یہ خیال آتا رہا کہ مجھ پر خدا کا فضل کیوں نہیں ہے۔ ان بہت سی خواہشوں اور حسرتوں کا خیال آتا رہا جنھیں روپیہ پاس نہ ہونے کے سبب وہ پورا نہ کر سکا تھا۔ اپنی بیمار اور کمزور بیوی کا خیال آتا رہا جس کے لئے محدود آمدنی ہونے کی وجہ سے وہ

طاقت کی دوا نہ خرید سکا تھا۔ اپنے بچوں کا خیال آتا رہا۔ جن کا نشوونما ترقی کی بجائے تنزل کی طرف ہو رہا تھا اور جو پچھلے پندرہ دن سے جوتے ٹوٹ جانے کی وجہ سے تقریباً ننگے پاؤں چلتے پھرتے تھے۔ یہ سب باتیں پہلے کی واقع شدہ تھیں۔ مگر اس سے پہلے اُسے ان کا خیال آکر اتنا رنج نہ ہوتا تھا جتنا کہ شوکت کی بات سننے کے بعد ہوا۔ شوکت نے اُس کے چہرے پر رنج و تفکر کے آثار دیکھے بھی اور محسوس بھی کئے اور اس سے پوچھا "اختر صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ تو کچھ کھو سے گئے ہیں۔" اختر نے زبان سے تو کہا جی نہیں کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" لیکن پھر اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔

کھانے سے فراغت پائی تو شوکت نے دیدہ و دانستہ بل ادا کرنے میں دیر کر دی۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ اختر کو اس کی .... بات بُری لگی ہے اور گو اب بھی وہ نہ چاہتا تھا کہ اختر پر چار پانچ روپیہ کا بوجھ ڈالے لیکن اختر کی پژمردگی بھی تو اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ مگر اختر اسی طرح بیٹھا رہا اُسے پیسے دینے کا خیال ہی نہ آیا۔ وہ تو اپنی تنخواہ —— نہیں بلکہ اپنی آمدنی کے محدود ہونے کے متعلق سوچتا رہا۔ بالآخر شوکت ہی نے بل ادا کیا۔

جلسے میں پہنچے تو اختر کو اپنی کمتری کا احساس اور زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگا۔ بہت خوبصورت بنے ہوئے ڈائس پر مختلف صوبوں کے نمائندے بہت خوبصورت اور قیمتی لباس پہنے بڑی شان سے اکڑے بیٹھے تھے۔ اختر نے سوچا یہاں بھی وہی محدود آمدنی کا سوال موجود ہے۔ اگر ان لوگوں کی آمدنیاں محدود ہوتیں تو یہ لیڈر کیسے بن سکتے۔ اُس کے دل کو تکلیف پہنچی کہ لیڈر بننے کے لئے بھی وافر روپیہ کا پاس ہونا اشد ضروری ہے۔ گو اس بات کا احساس اس کے لئے نیا نہ تھا۔ پھر بھی وہ سوچتا رہا —— اور یہ لوگ نمائندے کن کے

ہیں؟ غریبوں کے:۔۔ان کے جنھیں دو وقت پیٹ بھرنے کو روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ اُن کے جنھیں پیٹ پالنے کے تفکرات سے یہ معلوم کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ نمایندہ کسے کہتے ہیں اور نمایندے کو کیا کرنا چاہئے۔ آہ غریب کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ وہ امیروں کے بنائے ہوئے خوبصورت جالوں میں کتنی خوشی سے آکر پھنس جاتے ہیں۔ یہ جاہ وحشمت کے طلبگار یہ کرّ و فر کے دلدادہ لیڈر، غریبوں کی مشکلوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ یہ جو کبھی غریب نہیں رہے جنھوں نے کبھی غریبوں کے ساتھ زندگی نہیں گزاری۔ یہ محلوں میں رہنے والے یہ انواع واقسام کے ملذ ذکھانے کھانے والے کیا جانیں کہ جھونپڑیوں میں کن تکلیفوں سے زندگی گزاری جاتی ہے۔ انھیں کیا خبر کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔

لیکن انھیں لیڈر کس نے بنایا۔ یہ یہاں سوا لاکھ آدمی ان کی باتیں سننے کے لئے کیوں آگئے۔ مگر محدود آمدنی کا آدمی کبھی لیڈر نہیں بن سکتا۔ اُسے تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے اور جسم ڈھانپنے کی کوشش کرنے میں اپنی تمام طاقتیں ۔۔۔ اپنی تمام صلاحیتیں نہایت سستے داموں بیچ دینا پڑتی ہیں اور پھر بھی نہ اچھی طرح پیٹ بھرتا ہے اور نہ جسم ہی ڈھانپا جاتا ہے۔

جلسہ شروع ہوا۔ لیڈروں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ بعض کی تقریروں سے جلسہ میں جوش کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور زندہ باد کے نعروں سے شامیانوں کی چھت تک گونج اُٹھی۔ شوکت نے جلسہ کی کارروائی میں خوب دلچسپی لی۔ لیکن اختر بدستور اپنے خیالات میں کھویا رہا۔ اُس نے سوچا کہ ایک اسی جماعت پر کیا مخصوص ہے۔ دوسری جماعتوں میں بھی بڑے بڑے رئیس آدمی اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ غریبوں کو نہ وہاں کوئی پوچھتا ہے نہ یہاں۔

اختر کو خیال آیا کہ اسکول کے زمانہ میں اور پھر اس کے بعد کالج کے زمانے میں

اس نے تقریریں کرنے میں کئی مرتبہ اول درجے کے انعامات حاصل کئے تھے اور اب بھی وہ بہتوں سے اچھی تقریر کر سکتا تھا۔ کالج کے زمانے میں قوم کی خدمت کرنا اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد وہ تین سال اس مبارک کام کے لئے وقف بھی کئے رکھے۔ لیکن انجام ـــــ بیوی فاقے مرنے لگی۔ خود جہاں بھی جاتا جلی کٹی باتیں سننے میں آتیں۔ لوگ کہتے یہ کیا قوم کی خدمت کریگا اس سے تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ تک نہیں پالا جاتا۔ یہ تو قوم پر اپنا اور اپنے بچوں کا بار ڈال رہا ہے۔ پھر یہ کہیں جا کر تقریر کرتا یا کوئی بہت بڑا کام بھی کرتا تو بھی بعض دفعہ اخباروں میں نام تک نہ آتا اس کے مقابلے میں ان کا ایک اور ہم جماعت تھا جو کسی بہت بڑے سیٹھ کا لڑکا تھا وہ اگر ایک پتھر بھی اٹھا کر کہیں پھینک دیتا تو اخباروں میں اس بات کا بھی تذکرہ ہوتا اور بڑی شان سے ہوتا۔ پھر ایک جماعت نے جس کا یہ بھی رکن تھا سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی یہ بھی جیل چلا گیا۔ لیکن بڑے بڑے امیر لیڈروں کو تو 'اے کلاس' ملی اور سب طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اور ان کے گھر والوں کے رئیسانہ اخراجات پورا کرنے کے لئے ماہانے مقرر کئے گئے اور اسے کیا ملا۔ مشقت اور مزدوری اور اس کے گھر والوں کو فاقہ مستی۔ غرضیکہ ان تلخ تجربوں سے مجبور ہو کر اس نے سمجھ لیا کہ قوم کو سچی اور بے لوث خدمت کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت نہیں بلکہ منافقوں اور ریاکاروں کی ضرورت ہے ـــــ شاید اس لئے بھی کہ یہ ریاکار اور منافق اخبار والوں کی مٹھیاں گرم کرتے رہتے اور اس کے بدلے میں اخبار والے انھیں خوب اچھالتے ہیں۔

اختر غریبی اور امیری کے تفاوت پر غور کرتا رہا اور سر اقبال مرحوم کا مشہور شعر تھوڑی سی ترمیم کے بعد زیر لب گنگناتا رہا:۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں غربت میں جینا ہے وہاں دوزخ میں جینا ہے

تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اسے شوکت کی بات بھی یاد آتی رہی کہ آپ کی آمدنی محدود ہے۔ اگر اس کی آمدنی محدود نہ ہوتی تو وہ اس درجہ میں کیوں بیٹھا ہوتا اُسے بھی خوبصورت بنے ہوئے ڈالئس پر جگہ ملتی اور نمایاں جگہ ملتی۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ اختر شوکت کی بات بھول گیا اور پھر اپنے معمول کے مطابق بے لطفی میں دن گزارنے لگا۔ نہ خوشی نہ رنج۔ دن رات اُس کے چاروں طرف ایک بے حسی سی چھائی رہتی۔ تاہم اپنی حالت پر اس نے پہلے کی طرح قناعت کر لی تھی۔ پھر ایک دن اُس کا رشتہ کا ایک بھائی ملنے آیا اور آتا ہوا بچوں کے لئے پھل لے آیا۔ پہلے بھی جب وہ آتا تھا بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لیے ہوا آتا تھا۔ گو اختر اور اُس کی بیوی منع کرتے رہتے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد انعام نے کہا "آئیے بھائی جی آج تو بائیسکوپ چلیں"

وہ پہلے بھی کئی دفعہ اختر کو سینما دیکھنے کی دعوت دے چکا تھا۔ مگر اختر اپنی جیب کا خیال کر کے ٹال دیتا تھا۔ اُس دن بھی اُس نے انکار کیا۔ لیکن انعام اصرار کرنے لگا کہ آج تو میں آپ کو ضرور لے کر چلوں گا۔ اختر نے دل میں سوچا کہ یہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی چیز بچوں کے لئے لے آتا ہے۔ اب سینما کے لئے ضد کر رہا ہے تو اس کے ساتھ چلا جاؤں اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ لیا کہ ٹکٹ خود خرید لوں گا یہ روپے ڈیڑھ روپے کے پھل لے آیا ہے۔ میں اتنے ہی پیسے یا اس سے کچھ زیادہ سینما میں خرچ کر دوں گا۔

وقت سے پہلے گھر سے چل دیئے۔ جب سینما گھر پہنچے تو سہ پہر کا شو بھی ختم نہ ہوا تھا۔ انتظار کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا قریب کے رسٹوران میں چلے گئے اور

انعام نے ایک دم کئی چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ اختر سوچنے لگا کہ اب اگر یہاں بھی پیسے دیئے اور تماشے کے ٹکٹوں کے بھی تو بہت زیادہ پیسے خرچ ہو جائیں گے اور مجھے حق نہیں پہنچتا کہ بیمار اور کمزور بیوی اور ننگے پاؤں پھرنے والے بچوں کا خیال نہ کر کے اتنے پیسے تماشے پر خرچ کر دوں لیکن یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ انعام کو پیسے دینے دے۔ پھر اُسے انعام کی جلد بازی پر غصہ آیا کہ اُس نے ایک دم کئی چیزیں لانے کے متعلق کہہ دیا۔ اگر وہ ذرا دیر چپ رہتا تو تو میں وغیرہ کوئی ایک آدھی چیز منگا لیتا۔

جب کھا پی چکے تو اس نے 'بوائے' سے کہا کہ بل لے آؤ۔ اور نوٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ انعام بولا "پیسے میں دوں گا بھائی جی" اُس نے کہا "نہیں۔ آپ کیوں دیں گے"۔

اتنے میں 'بوائے' پلیٹ میں رکھ کر بل لے آیا اور انعام نے فوراً دو روپے کا نوٹ اُس کے حوالے کر دیا۔

اختر کو اطمینان تھا کہ چلو تماشے کے ٹکٹ میں خریدوں گا اور اس طرح حساب برابر ہی رہے گا۔ بلکہ میرے پیسے زیادہ خرچ ہوں گے اور اس کی اُسے پروانہ تھی۔ دوسرے سے زیادہ پیسے خرچ کر کے اس کے دل کو ہمیشہ خوشی حاصل ہوتی تھی لیکن سینما ہال کے قریب پہنچتے ہی جب انعام ایک دم لپک کر ٹکٹ والی کھڑکی کے پاس جانے لگا تو اختر نے اُسے پکڑ لیا اور بولا "اب یہ نہیں ہوگا۔ ٹکٹ میں خریدوں گا"۔

"میرے اور آپ کے پیسے کیا الگ الگ ہیں؟"

"تو اب مجھے خریدنے دیجئے" اُس نے انعام کو اپنی گرفت سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

انعام پھر کٹ کی کھڑکی کی طرف لپکا۔

اختر نے اُسے پھر پکڑ لیا۔

انعام نے کہا "بھائی جی مانئے بھی۔ مجھے ہی خریدنے دیجئے۔

لیکن اختر نہ مانا اور ضد کرتا رہا۔

انعام نے کہا "بھائی جی بات یہ ہے کہ آپ کی آمدنی محدود ہے۔"

محدود کا لفظ سنتے ہی اختر نے انعام کو فوراً چھوڑ دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ انعام نے گرم گرم پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں ڈال دیا اور ساتھ ہی پاؤں کے نیچے سے زمین بھی کھینچ لی۔ اگر وہ قریب کے ستون کا سہارا نہ لے لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ جب اُس کی آمدنی محدود ہے تو اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ سنیما دیکھے یا کسی اور لہو و لعب میں کسی کے ساتھ شامل ہو۔

تماشے میں اُسے خاک بھی لطف نہ آیا۔ بیٹھا ہوا محدود اور غیر محدود کے فرق کے متعلق سوچتا رہا۔ ہاں سوچتا رہا کہ اس کی آمدنی محدود کیا ہوئی ہر چیز ہی محدود ہو گئی۔ اس کا سب کچھ محدود ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ اس نے سوچا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے ان دونوں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن صرف تنخواہ کا کیا ہے۔ انھیں دستِ غیب سے بہت زیادہ روپیہ مل جاتا ہے۔ اختر ایسے محکمہ میں تھا جہاں تنخواہ سے کچھ کم ہی پلے پڑتا تھا۔ دو چار روپے مہینے میں ضرور کم ہو جاتے تھے اور یہ کمی تنخواہ میں سے پوری کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس محکمہ میں وہ دیدہ و دانستہ آیا تھا اور ایسے محکمہ میں سے آیا تھا جہاں کہ حسبِ دلخواہ آمدنی ہو سکتی تھی۔ مگر اس وقت اس کے خیالات کچھ اور تھے۔ اُس وقت اس قسم کا ایک پیسہ لینا بھی وہ حرام سمجھتا تھا اور اب

اب وہ اپنے اس معیار پر قائم نہ رہ سکا تھا جو اس نے اپنے لئے مقرر کیا تھا۔ اب اُس کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ اب اُس کے دو بچے ہو گئے تھے۔ اور بدقسمتی سے دونوں بیمار رہتے تھے۔ اب اُس کی بیوی دائم المریض تھی۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ چیزیں بے حد گراں ہو گئی تھیں۔ بچوں کی تربیت کے لئے اور اُن کے اور بیوی کے علاج معالجہ کے لئے اور زندگی کی دوسری اہم ضرورتیں پورا کرنے کے لئے اُسے روپیہ چاہئے تھا۔ لیکن اُس کی آمدنی محدود تھی۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح گزر کر رہا تھا اور ایک حد تک مطمئن بھی تھا۔ مگر پہلے ایک دوست سے اور پھر ایک بھائی سے اپنی آمدنی کے محدود ہونے کے متعلق سن کر وہ اپنا تمام صبر و ضبط، اپنی تمام قوتِ قناعت کھو بیٹھا۔ اس کے دل میں تو شوکت ہی کی بات تیر بن کر لگی تھی اب انعام کی بات سے تو گویا اُس کا کلیجہ بالکل ہی چھلنی ہو گیا۔

تماشہ بہت دلچسپ تھا۔ ایک مشہور فلم کمپنی کی مزاحیہ فلم دکھائی جا رہی تھی لیکن اختر کو نہ لطف آنا تھا اور نہ آیا۔ اُس نے اپنی نظریں اسکرین پر ضرور گاڑ رکھی تھیں۔ لیکن وہ کچھ دیکھ نہ رہا تھا۔ وہ تو خود اپنے دماغ میں ایک فلم تیار کر رہا تھا ——— ایک المناک فلم ان سب ناکامیوں کا اب اُس کی سمجھ میں صرف ایک ہی علاج آتا تھا۔ لیکن وہ علاج بہت خطرناک تھا۔ اور اس علاج کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش میں اُسے اپنی بیوی بچوں کا خیال مانع تھا۔

پھر کچھ دن گزر گئے اور دنوں کے ساتھ اختر کے دل میں انعام کی بات کا زخم بھرتا چلا گیا۔ پھر ایک روز وہ دفتر سے آ رہا تھا کہ اُسے اپنے خوابوں کی ملکہ مل گئی۔ وہ لڑکی مل گئی جو کالج میں اُس کے ساتھ پڑھتی تھی اور جس سے اُسے پہلے انتہا عشق تھا اور جس سے بعد میں خوش قسمتی سے دوستانہ مراسم بھی

پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن اختر کے غریب ہونے کی وجہ سے اُن کی محبت پروان نہ چڑھ سکی تھی۔ اختر نے جو اُسے دیکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ بہت مدت کے بیتے دلوں کی طرح ایک مرتبہ پھر زندگی کی ساری مسرتیں اُس لڑکی کا روپ دھار کے اُس کے سامنے آگئی ہیں۔ اُس نے اُسے سلام کیا۔ لڑکی نے بڑے تپاک سے جواب دیا اور مزاج پوچھنے لگی۔ اختر کو حیرت ہوئی۔ اُس کا خیال تھا کہ اب شاید وہ لڑکی اُسے پہچان بھی نہ سکے۔ لیکن لڑکی نے نہ صرف اُسے پہچان ہی لیا۔ بلکہ ملی بھی اُسی التفات سے جس سے کالج کے زمانے میں وہ ملا کرتی تھی۔ اختر نے ہچکچاتے ہوئے اُسے قریب کے ریسٹورنٹ میں چائے پینے کی دعوت دی۔ لڑکی نے ریسٹورنٹ کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور بولی "اس ریسٹورنٹ میں؟ اچھا چلیئے" یہ انگریزی ریسٹورنٹ تھا۔ اختر کبھی اس میں چائے پینے کیوں گیا تھا۔ دعوت دینے کو تو اُس نے دیدی تھی۔ لیکن اندر جاتے ہی کچھ گھبرا سا گیا گو ہنسی ہنسائی باتوں اور کتابوں کے علم پر اُسے اعتماد تھا کہ نبھا جائے گا۔ لیکن پھر دل و دماغ پر ایک جھجک سی مسلط کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ لڑکی نے اُس کی گھبراہٹ اور جھجک دیکھی بھی اور محسوس بھی کی اور نہایت بے تکلفی سے خود چائے کا آرڈر دے دیا۔

چائے پیتے ہوئے لڑکی نے بڑی ہمدردی سے اُس کا حال پوچھا اور مشاغل دریافت کئے۔ اختر نے جو کچھ ان پر گزر چکی تھی مختصر الفاظ میں سب کچھ سنا دی اور کہا اب تو دفتر کی کلرکی ہے اور اختر ہے۔

اپنی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُس پر کمتری کا احساس پھر مستولی ہو گیا۔ تاہم وہ مسرور تھا کہ آخر آج اس سے باتیں کرنے کا موقع تو ملا جس کے خیال ہی سے دل کو سرور حاصل ہو جاتا تھا۔ جس کے تصور ہی سے دنیا بھر کی

راحتیں آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی تھیں۔ جس کی یاد ہی سے آفات و آلام بھول جاتے تھے۔ آخر آج اُس نے سامنے بیٹھ کر حال تو سُنا۔

لیکن مسرت کی گھڑیاں بہت مختصر ہوتی ہیں۔ چائے پینے کا وقت بھی بہت جلد گزر گیا۔

بیرا بل لایا تو اختر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنا کیش بیگ کھولا اور بولی "بل میں ادا کر دوں گی، اختر صاحب!"

"جی نہیں یہ ہرگز نہیں ہوگا" اختر نے جیب سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے مجھے ہی پیسے دینے دیجئے" لڑکی نے پھر کہا۔ اس مرتبہ وہ اختر کی طرف دیکھ بھی رہی تھی اور مسکرا بھی رہی تھی۔ لیکن اختر نے بیرے کو نوٹ دے دیا۔ لڑکی نے تحکمانہ انداز میں بیرے سے کہا "آپ کا نوٹ واپس کر دو" بیرے نے نوٹ اختر کے آگے میز پہ رکھ دیا۔ اختر بولا۔ "نہیں نہیں یہ یونہی کہہ رہی ہیں تم یہ نوٹ لے جاؤ۔"

لڑکی نے ذرا لجاجت سے کہا "اختر صاحب ضد نہ کیجئے بل مجھے ہی ادا کرنے دیجئے۔ آپ کو بیمار بیوی بچوں پہ بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔"

اختر نے کہا "آپ اس بات کا خیال نہ کیجئے" لڑکی بولی "اور آپ کی آمدنی بھی تو محدود ہے۔"

سوئے اتفاق سے لڑکی نے بھی لفظ "محدود" ہی استعمال کیا۔ اختر کو ایسا محسوس ہوا کہ لڑکی نے انگاروں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا ٹوکرا اُس کے سر پہ اُلٹ دیا۔ وہ ایک دم کرسی سے اُٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

یہ دلّی ہے!

مرزا جی ملازمت کی تلاش میں دلی آئے تھے۔ پچھلے دنوں جب میں وطن سے دس دن کی چھٹی گزار کر چلنے لگا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی آؤں گا۔ جس تاریخ کو اُنھوں نے تشریف لانے کے متعلق کہا تھا اُس روز میں اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اُس روز نہ آسکے اور دوسرے دن میں اسٹیشن نہ جا سکا۔ جب میں اسٹیشن جانے کے متعلق غور کر رہا تھا تو ایک دوست آئے اور مجھے زبردستی سینما لے گئے۔ زبردستی اس لئے کہ جس سینما گھر میں وہ لے گئے وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ لیکن ان کے پاس 'پاس' ہی اس فلم کے تھے جو اس سینما گھر میں چل رہی تھی۔ فلم دیکھ کر واپس آیا تو دیکھا کہ مرزا جی براجمان ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ آپ کا گھر ڈھونڈنے میں بڑی دقت ہوئی۔ میں نے عرض کیا ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن کل میں آپ کے لئے اسٹیشن گیا تھا اور

آپ تشریف نہیں لائے" ارشاد ہوا کہ ہاں کل میں نہیں آسکا۔ میں نے کھانے کے متعلق دریافت کیا فرمانے لگے۔ میں رستہ میں سے دودھ پی آیا ہوں۔

اس کے بعد جو ان سے باتیں ہوئیں تو ظاہر ہوا کہ حضرت کسی بات سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ لیکن خوشی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی اور پھر انھوں نے فرمایا کہ نیند آرہی ہے۔ میں نے ملازم سے ایک پلنگ پر بستر بچھوادیا اور مرزاجی سو گئے۔

دوسری صبح بھی مرزاجی کچھ دیر سے اُٹھے۔ میں ضروریات سے فارغ ہو کر قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ آپ میرے قریب آئے اور فرمانے لگے۔ "یہ انڈیپنڈنٹ کیا نیا خریدا ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں ابھی کوئی ہفتہ ہوا سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اخبار میں اشتہار بھی نکلوادیا تھا مگر کوئی صاحب لینے نہیں آئے۔

کہنے لگے۔ "یہ تو زنانہ معلوم ہوتا ہے"

میں نے کہا "تو مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ کوئی صاحبہ لینے نہیں آئیں"

تھوڑی دیر مسکرا کر ارشاد فرمایا "رات مجھے بھی ایک چیز پائی ہے لیکن اس طرح پڑی ہوئی نہیں ملی"

میں نے اُن کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا

برابر والی کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگے۔ "میں رات ہی آپ کو یہ بات بتانا چاہتا تھا مگر پھر مصلحت اسی میں نظر آئی کہ صبح کو بتائی جائے۔

میں نے بات سنے بغیر ہی کہہ دیا "یہ تو آپ نے اچھا نہیں کیا"

پھر کہنے لگے۔ "میں نے اسٹیشن سے نکل کر ایک مزدور لڑکے کے سر پر اپنا سوٹ کیس اٹھوایا اور کہا قطب روڈ چل۔ خیال تھا کہ قطب روڈ سے تانگہ لوں گا۔ کھاری باولی سے ہم گزر رہے تھے کہ ایک نوجوان نے میرے قریب آکر کہا۔ کیوں صاحب آپ کو معلوم ہے کہ باڑہ ہندو راؤ کدھر ہے۔ میں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں۔ لیکن اس مزدور لڑکے سے پوچھتے ہیں۔ یہ ضرور جانتا ہوگا۔ اور لڑکے نے بتایا کہ قطب روڈ سے جو سڑک صدر بازار کو جاتی ہے وہی باڑہ ہندو راؤ پہنچ جاتی ہے۔ میں نے نوجوان سے کہا آپ ہمارے ساتھ چلے آیئے۔ اور وہ مجھ سے باتیں کرتا ہوا میرے برابر برابر چلنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ میں بریلی کا رہنے والا ہوں اور دو ایک دن کے لئے دہلی کی سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ ابھی ہم تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ ہمارے سامنے ایک جھلی والے نے زمین پر بیٹھ کر کوئی چیز اُٹھائی۔ میرے ساتھی نے ایک دم اُس سے پوچھا "کیا ہے؟" جھلی والے نے جواب دیا "صابن کی ٹکیہ ہے بابوجی۔"

تھوڑی دور ہم اور چلے تھے کہ پچھلی جانب سے ایک آدمی نے آکر پوچھا۔ "آپ نے کسی کو کوئی چیز تو اُٹھاتے نہیں دیکھا۔" وہ آدمی بہت پریشان سا ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک ساتھ پوچھا "کیا بات ہے؟" اُس نے کہا کہ مجھ سے سونے کے کڑوں کی جوڑی گر گئی ہے۔ ساڑھے پانسو کی لاگت کے تھے۔ ہم نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر ہوئی جھلی والے نے زمین پر سے کوئی چیز اُٹھائی تھی۔ مگر ہمارے پوچھنے پر اُس نے کہا تھا کہ صابن کی ٹکیہ ہے آدمی نے ایک دم پوچھا وہ جھلی والا کدھر کو گیا تھا۔ ہم نے

کہا" ادھر ہی کو جا رہا تھا پھر کسی اور طرف مڑ گیا ہو تو معلوم نہیں۔ وہ بیچارہ پہلے کچھ دور تو اُس سڑک پر سیدھا گیا پھر بائیں جانب مڑ گیا۔ میرے دل میں اُس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی اور میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ غریب تو مارا گیا۔ اب اسے کپڑے کیا ملیں گے۔ اور میرے ساتھی نے کہا کہ میں نے جھلی والے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اب اگر وہ مجھے مل گیا تو میں فوراً پہچان لوں گا۔

ہم چلتے رہے قطب روڈ سے پہلے جو پُل آتا ہے تو اس پُل سے اُس طرف ایک جھلی والا بیٹھا پیشاب کر رہا تھا۔ میرا ساتھی چلتا چلتا کھڑا ہو گیا اور کچھ غور سے دیکھ کر کہنے لگا "یہ ہے وہ جھلی والا۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ جب جھلی والا پیشاب کر کے اُٹھا تو میرے ساتھی نے ذرا سخت آواز سے کہا "کیوں بے وہ صابن کی ٹکیہ کہاں ہے؟" اُس نے سہم کر جواب دیا" میرے پاس ہے بابو جی" نوجوان نے پھر سختی سے کہا "صابن کی ٹکیہ کہ سوئے کے کڑوں کی جوڑی۔ جھلی والا چپ ہو گیا۔ تو نوجوان نے پھر کہا کہ جلدی نکال نہیں تو پولیس میں لے چلتے ہیں تجھے۔ جھلی والا بولا" لیکن بابو جی کپڑے آپ کے بھی تو نہیں" نوجوان نے کچھ سوچ کر کہا کہ اچھا دیکھ ہم دونوں تجھے پانچ پانچ روپے دے دیتے ہیں۔ تو ہمیں کپڑے دیدے۔ جھلی والا اُس سے بھی ہوشیار تھا کہنے لگا تم مجھ سے پچاس پچاس روپے لے لو اور کپڑے میرے پاس رہنے دو۔

ہم سڑک سے ذرا ہٹ کر یہ باتیں کر رہے تھے اور اصل میں بات تو وہ جھلی والا کر رہا تھا۔ میں تو اُن کے قریب کھڑا سڑک پر آتے جاتے

لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے تو کوئی ہماری باتیں نہیں سنتا ۔ مزدور لڑکے کو بھی میں نے اُس کے پیسے دیکر روانہ کردیا تھا میرے ساتھی نے کہا اچھا لا سو روپے ہم جاتے ہیں ۔ جھلی والے نے کہا "میرے پاس یہاں تو نہیں ہیں گھر چلو تو میں دے دیتا ہوں ۔" میرے ساتھی نے پھر کہا "گھر جانے کی بات نہیں ۔ یہاں فیصلہ کرنا ہے تو کر نہیں تو چل تھانے میں ۔"

قصہ مختصر میرا ساتھی روپوں کی تعداد بڑھاتا رہا اور جھلی والا نا منظور کرتا رہا ۔ میں بھی کسی کسی بات میں اُس سے کہہ دیتا تھا کہ اگر ہم تجھے تھانے میں لے گئے تو بیٹا تجھے ایک روپیہ بھی نہ ملے گا اور کپڑے بھی چلے جائیں گے ۔ لیکن وہ بہت ہی کائیاں تھا کہتا " تو بابو جی تمھیں بھی تو کچھ نہ پادے ۔"

آخر میرے ساتھی نے پچاس پچاس روپے لگا دیئے اور کہہ دیا کہ اگر تجھے سو روپے بھی منظور نہیں تو تیری مرضی ۔ چل جا کر پولیس والوں کے سپرد یہ کپڑے کر دے اور اپنی راہ لے ۔ جھلی والے نے جب دیکھا کہ یہ سو روپوں سے ایک روپیہ بھی نہ بڑھیں گے تو وہ راضی ہوگیا ۔ میرے ساتھی نے فوراً اپنی جیب سے پچاس روپے کے نوٹ نکال کر اُسے دے دیئے ۔ لیکن میرے پاس صرف پینتیس روپے اور کچھ آنے تھے میں نے انھیں ایسا ہی بتا دیا ۔ میرے ساتھی نے کچھ سوچ کر کہا ۔ دو ایک کپڑے دیدو ۔ لہٰذا میں نے سوٹ کیس کھول کر اُسے دو قمیص اور دو شلواریں دیدیں ۔ جھلی والے نے سوٹ کیس کھلا دیکھ کر اور زیادہ پاؤں پھیلائے ۔ ایک چادر بھی دے دو بابو جی ، اور پھر ایک دھوتی بھی ۔

اُس نے روپے اور کپڑے لے کر دونوں کڑے میرے ساتھی کو دیدیئے اور ساتھی نے ایک کڑا خود رکھ لیا اور ایک مجھے دے دیا۔ جھلی والا تو پیچھے لوٹ گیا۔ ہمیں آگے جانا تھا۔ قطب روڈ پر پہنچ کر میرا ساتھی بولا کہ بھئی میں تو ابھی بریلی واپس جاتا ہوں۔ مبادا کوئی بات ہو جائے۔ اور میں آپ کو بھی رائے دیتا ہوں کہ آپ بھی واپس چلے جائیں۔"

میں نے مرزا جی کی ساری بات بڑے غور سے سنی اور درمیاں میں مناسب ہنکارے دیتا رہا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکے تو میں نے کہا:-

"لیکن مرزا جی کہیں وہ کڑے نقلی سونے کے نہ ہوں۔"

انھوں نے نہایت وثوق سے کہا۔ نقلی سونے کے نہیں ہو سکتے۔" اور پھر سامنے کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہ دوسرے مکان سے تو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے جلدی سے سوٹ کیس میں سے نکال کر مجھے دکھا اور جلدی ہی سے واپس سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

وہ خوش تھے کہ پچاس روپے میں پونے تین سو کا مال مل گیا۔ لیکن میں ڈر رہا تھا کہ یہ دلّی ہے۔ مرزا جی کو یقیناً دھوکا دیا گیا۔ ساری باتیں ایک افسانے کی طرح واقع ہوئی تھیں۔ بریلی والے نوجوان کا مل کر ساتھ چلنا۔ آگے جھلی والے کو کوئی چیز پانا اور اس نوجوان کا پوچھنا۔ پھر ایک آدمی کا گھبرائے ہوئے آکر دریافت کرنا۔ اور پھر یہ بتانا کہ ساڑھے پانسو روپے کے کڑے تھے۔ پھر آگے جھلی والے کا پیشاب کرتے ہوئے مل جانا۔ لیکن مرزا جی اتنے خوش تھے کہ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُن کی

خوشی کو رنج میں تبدیل کروں۔

دو تین دن کے بعد جب وہ وطن واپس جانے لگے تو انھوں نے پھر کڑے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے کہا "مرزا جی! یہ دلی ہے مجھے تو یقین نہیں آتا کہ کڑا اصلی سونے کا ہوگا"

اور یہی ہوا۔ گھر جا کر جو انھوں نے سنار کو دکھایا تو پتہ چلا کہ صاف دھوکا تھا۔

"شیخ صاحب آپ یہ یاقوت اپنے پاس رکھ کر دیکھئے شاید آپ کو موافق آجائے۔" نصیر نے یاقوت کا چنے سے ذرا بڑا ٹکڑا اسلم کو دیتے ہوئے کہا۔

اسلم نے مسکراتے ہوئے یاقوت کا ٹکڑا لے کر اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔ وہ نصیر سے اس ٹکڑے کے متعلق کئی موقعوں پر کئی قسم باتیں سُن چکا تھا۔

نصیر پھر بولا "کچھ دن اپنے پاس رکھ کر دیکھ لیجئے۔ اگر خدانہ کرے کوئی بات بدنصیبی کی ظاہر ہو تو فوراً مجھے واپس کر دیجئے۔ نہیں تو اپنے پاس رہنے دیجئے۔ خدا مبارک کرے۔"

نصیر بہت وہمی طبیعت کا آدمی تھا۔ فالنامہ اور تعبیر نامہ ہمیشہ اُس کے سرہانے تکیہ کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ صبح کو اُٹھتا تو سب سے پہلے تکیے

نیچے سے تعبیر نامہ نکال کر رات کے خواب کی تعبیر دیکھنے لگتا۔ کوئی نیا کام شروع کرتا تو فال نامہ لے کر بیٹھ جاتا۔ اس کے علاوہ کہیں کوئی رملیہ سڑک کے کنارے بیٹھا نظر آیا اور یہ اُسے اپنا ہاتھ دکھانے بیٹھ گیا اور اپنی قسمت کی باتیں معلوم کرنے لگا۔ وہ لوگ اُسے ہمیشہ یہی بتاتے کہ آپ پر آج کل گردش کے دن ہیں۔ بس کوئی چھ سات مہینے اور چکر کے ہیں اس کے بعد آپ ہوں گے اور دنیا بھر کی راحتیں۔ اور یہ سن کر وہ اپنے غم بھول جاتا۔ بعض دفعہ تو بہت ضروری کاموں کے متعلق کوشش کرنا بھی ترک کر دیتا۔ سوچتا کہ ابھی تو گردش کے دن ہیں ابھی کام نہ بن سکے گا۔

اُس نے یاقوت کا یہ ٹکڑا اپنے ایک دوست سے لیا تھا جس کا بیان تھا کہ جب سے میرے پاس یہ یاقوت آیا ہے راکھ میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتا ہے۔ نصیر نے کہا "یار تم نے تو بہت سونا بنا لیا۔ اب کچھ دن کے لئے اسے مجھے دے دو۔ میں بھی اپنی قسمت آزما لوں"۔ اور دوست نے ہنستے ہوئے کہا "میں تو مذاق کر رہا تھا تم نے سچ ہی مان لیا۔ یاقوت میں اگر یہ خاصیت ہوتی تو سب لوگ اس کے ٹکڑوں کو اپنے پاس رکھ کر امیر بن جایا کرتے"۔

نصیر نے کہا۔ "لیکن موافق آنے کی بات ہے"۔

دوست نے پہلے کی طرح ہنستے ہوئے کہا "موافق آنے کا کیا مطلب؟ یہ بھی کوئی انگریزی دوا ہے کہ موافق آگئی تو فوراً فائدہ اور ناموافق رہی تو فوراً نقصان"۔

"بالکل یہی بات ہے"۔ نصیر نے زور دے کر کہا۔

"میں تو مانتا نہیں" دوست نے جواب دیا۔

"آپ کو ماننا بھی نہیں چاہیئے"

دوست سمجھ گیا کہ نصیر کے دل میں اس وقت یہ خیال آرہا ہے کہ میں اُسے یاقوت دینا نہیں چاہتا۔ اسی لئے ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ لہٰذا وہ گھر میں گیا اور یاقوت کا ٹکڑا لاکر بولا :۔

"ان باتوں پر آپ کو اگر اتنا یقین ہے تو آپ شوق سے یہ یاقوت لے سکتے ہیں"

نصیر نے نہایت شوق اور شکریئے کے ساتھ یاقوت کا ٹکڑا لیا اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

پھر کئی دن تک وہ اس انتظار میں رہا کہ اب اچانک کوئی بہت اچھی خبر آنے والی ہے۔ مثلاً اُسے فوراً کوئی اچھی نوکری مل جائے گی یا کہیں سے کوئی خزانہ ہاتھ آجائے گا۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بات ——— کوئی امیر لڑکی اس پر دل وجان سے فریفتہ ہوجائے گی اور پھر عیش ہی عیش ——— لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی بات بھی واقع نہ ہوئی۔ نہ نوکری ملی اور نہ خزانہ اور نہ ہی کوئی امیر لڑکی عاشق ہوئی۔ اسی انتظار میں کئی ہفتے گزر گئے۔ پھر ایک دن وہ انھیں خیالات میں محو سائیکل پر سوار جارہا تھا کہ ایک تانگہ سے ٹکر ہوگئی۔ اس دن پہلی مرتبہ اس کے چوٹ کھائے ہوئے دماغ میں خیال آیا کہ شاید یاقوت موافق نہیں بیٹھا۔ پھر اس کے بعد پے بہ پے ایسی باتیں واقع ہوتی رہیں جن سے اُسے یقین ہوگیا کہ یاقوت اُس کے ستاروں کی گردش کو راس نہیں آیا۔ ایک جگہ سے اُسے بہت سارو پیہ

آنے کی امید تھی وہاں سے پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔ ایک نواب نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اُسے اپنا سکریٹری بنائے گا اُس نے بھی جواب لکھ بھیجا۔ پھر ایک بہت پُرانے دوست سے اَن بن ہوگئی جس سے اُسے کافی فائدہ پہنچتا رہتا تھا۔ اور آخر نصیر نے فیصلہ کرلیا کہ اس یاقوت کو وہ اپنے پاس نہ رکھے گا۔

لہٰذا اس نے وہ یاقوت اپنے نووارد اور نوجوان دوست کو دے دیا۔

کئی دن بیت گئے۔

اسلم سوچنے لگا کہ اب تک کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ یہ یاقوت میرے قسمت کے ستاروں کو موافق آیا ہے کہ نہیں۔ وہ کئی دن ایسی ترکیبیں سوچتا رہا جن سے کہ یاقوت کے گُن ایک دم کھل جائیں۔ سوچ سوچ کر اُس نے کنگ کمیشن کے لئے درخواست دے دی۔

اس سے پہلے وہ ایک دفعہ اس مقابلہ میں ناکام رہ چکا تھا۔ حُسنِ اتفاق کہیئے یا یاقوت کی کرامات کہ وہاں سے فوراً میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونے کی ہدایت آگئی۔ اسلم کو سخت تعجب ہوا۔ جو لڑکے کنگ کمیشن کے لئے درخواست دیتے تھے انھیں پہلے صوبجاتی بورڈ کے سامنے پیش ہونا ہوتا تھا۔ پھر جو اس انتخاب میں کامیاب ہو جاتے اُن کی ڈاکٹری کرائی جاتی اور جو ڈاکٹری میں بھی پاس ہو جاتے انھیں مرکزی بورڈ کے

سامنے حاضر ہونے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ تجربہ کے طور پہ صوبجاتی بورڈ کا جھگڑا ہی اُڑا دیا گیا۔

قصہ مختصر اسلم میڈیکل بورڈ میں کامگار رہا اور پھر مرکزی بورڈ سے بھی اے کلاس لے کر پاس ہوا۔ اور بنگلور ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

اسلم نصیر کی طرح وہمی طبیعت کا آدمی تو نہ تھا اور نہ ہی اُسے ستاروں کی گردش پر یا کسی اور چیز کے خوش یا بد نصیب ہونے پر کوئی خاص یقین تھا لیکن باتیں اتنی جلدی جلدی وقوع پذیر ہوئی تھیں اور ان سے پہلے نصیر کی کچھ عرصہ کی صحبت نے اُس کے دل میں یاقوت کی طرف سے ایک خاص اعتقاد پیدا کر دیا تھا۔ پھر ٹریننگ کے زمانہ میں اُس نے وہ وہ عیش کیے جو کبھی ساری زندگی میں اُس کے خواب میں بھی نہ آئے تھے۔ محبت —— نوجوان لڑکیوں کی گرم گرم محبت، اب نہ صرف اُسے حاصل ہو گئی تھی بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ مستفیض بھی ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب سمجھنے لگا تھا اور یہ سب کچھ اُس کے خیال کے مطابق یاقوت کے راس آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

لیکن ٹریننگ کی مدت آنکھ جھپکنے میں ختم ہو گئی اور انھیں مختلف مورچوں پر بھیج دیا گیا۔ اسلم کے لئے جو مورچہ تجویز کیا گیا وہ حد درجہ خطرناک تھا وہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ دم مارنے کی گنجایش کسے تھی۔ بس جہاں جانے کا حکم دیا چلا گیا۔ لیکن اسلم بہت پریشان تھا اور اسی پریشانی میں اُس کے دل میں یاقوت کی طرف سے بڑے بڑے خیالات آنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ یاقوت دراصل مجھے کبھی موافق نہیں آیا۔ یہ سب باتیں

تو اس لئے اتنی جلدی طے ہو گئیں کہ یہ میرے لئے ایک بہت بڑی
بدنصیبی ـــــ میدانِ جنگ میں خوفناک موت کی صورت میں لانے والا
تھا اور اُس کی جلد از جلد تکمیل کرنے کے لئے دوسری باتوں میں جلد
از جلد کامیاب کر دیا۔ اس قسم کے خیالات سارے رستے اُس کے
دل اور دماغ میں چکر لگاتے رہے اور میدانِ جنگ تک پہنچتے پہنچتے اس
نے یاقوت کے ٹکڑے کو اپنے بٹوے سے نکال کر حقارت سے ایک طرف
پھینک دیا۔

آگ بارود اور لوہے کی اتنی خطرناک لڑائی میں ہزاروں آدمیوں کا
مرجانا معمولی بات تھی۔

اسلم مارا تو نہیں گیا۔ لیکن ایک ٹانگ لڑائی میں ضرور کام آگئی۔

اور پھر وہ سوچنے لگا کہ اگر میں یاقوت نہ پھینکتا تو شاید میری یہ
ٹانگ بھی بچ ہی جاتی۔

ہماری زیر اشاعت کتابیں

شبستاں

فراق گورکھپوری کی اُن بلند ترین اور مشہور عالم غزلوں کا مجموعہ جو
اب تک کتابی شکل میں پیش نہیں ہوئیں — ۲۵۰۰ — ضخامت ۵۰۰ صفحات
سے زیادہ مجلد فی جلد ۔ چھ روپیہ — نومبر تک بازار میں آجائے گی۔

رُوپ

فراق گورکھپوری کی جمالیاتی یا سنگار رس کی ۳۵۰ رباعیوں کا مجموعہ
بہت قیمتی کاغذ پر، پانچ ایسی سہ رنگی تصویروں کے ساتھ جنھیں فن کا شاہکار
کہا جاسکتا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات فی جلد چھ روپیہ۔ نومبر تک

ہندوستاں ہمارا

بلونت سنگھ کے نئے شاہکار افسانوں کا مجموعہ —

دورِ جدید کی غزل گوئی

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ضخیم اور شگفتہ کتاب جو قدم قدم پر دل و دماغ
میں گدگدی پیدا کردے۔ دسمبر تک شائع ہو جائے گی۔

دل کا بوجھ

ظفر واسطی کے معرکہ آرا افسانوں کا نیا مجموعہ ۔ دسمبر تک شائع ہو جائیگی

نکات

فراق گورکھپوری کے وہ اشعار جن میں حیات و کائنات کے گہرے معنوی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

فکریات

فراق گورکھپوری کے مندرجہ بالا عنوان کے اشعار کا دوسرا مجموعہ ۔

دبستاں

مشاہیر اردو کے کارناموں پر فراق گورکھپوری کی بصیرت افروز تنقیدیں